فیاض احمد فیضی

قندِ مکرّر

(طنز و مزاح)

قندِ مکرّر

فیاض احمد فیضی

مصنف:

فیاض احمد فیضی

ناشر:

تخلیق کار پبلشرز

104/B ۔ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی ۔۱۱۰۰۹۲

نام کتاب : قندِ مکرّر

مصنف : فیاض احمد فیضی

پتہ : M5B/504, MHADA,Prateeksha Nagar, Sion, Mumbai-400022 M: 09323043113

تعداد : ۴۰۰

ناشر : انیس امروہوی

○ تخلیق کار پبلشرز

104/B۔ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی ۔۱۱۰۰۹۲

سرورق : مسعود التمش

کمپوزنگ : رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی ۔۱۱۰۰۹۲

مطبع : کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے:

- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۔۱۱۰۰۰۶
- کتابی دُنیا، ترکمان گیٹ، دہلی ۔۱۱۰۰۰۲
- اہلووالیہ بکڈپو، ۴۵/۹۹۸۸۔ نیو روہتک روڈ، دہلی ۔۱۱۰۰۰۵
- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۔۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۔۲۰۲۰۰۲ (یو۔پی)
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۔۱۱۰۰۰۶
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۔۸۰۰۰۰۴ (بہار)

T.P.: 0170

ISBN: 978-81-906461-5-4

QAND-E-MUKARRAR

(Humour)

By FAYYAZ AHMED FAIZI

2008

Rs. 150.00

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B - YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR, DELHI-110092

Ph.:011-22442572, 9811612373 E-mail:qissey@rediffmail.com

والدہ مرحومہ کے نام

بے ترتیب

خاکے / تبصرے

○○

ذرا نم ہو تو..........

آخر وہ گھڑی آ ہی گئی جس کا پچھلے سولہ برسوں سے آپ سب کو ڈر لگا ہوا تھا۔ اردو طنزیہ و مزاحیہ نثری ادب کے مرد شہ سواروں میں سوائے پطرس بخاری کے آج تک کسی کو یہ شرف حاصل نہیں ہو سکا کہ اس نے پہلی کتاب کی اشاعت کے بعد قلم توڑ کر رکھ دیا ہو۔ جس طرح فلمی عدالتوں میں منصف پھانسی کی سزا سنانے کے بعد کیا کرتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر جب تک کسی ادیب کی دوسری کتاب شائع نہ ہو جائے، قاری اور نقاد اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ شاعروں کی بات اور ہے، ان کا مرتبہ ان کے مجموعہ کلام سے نہیں، مشاعروں میں ان کی کارکردگی کی بنا پر طے کیا جاتا ہے۔ جہاں تک مزاح نگاروں کا تعلق ہے، وہ عام طور پر زود نویس ہوتے ہیں۔ قاری جب تک ایک کتاب ختم کرتا ہے، دوسری منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ کچھ مصنف تو احتیاطاً اپنی پہلی کتاب کے آخری صفحے پر اپنے تمام ارمانوں اور خوابوں کو "مصنف کی دیگر زیر ترتیب تصانیف" کے عنوان کے تحت شائع کر دیتے ہیں۔ لیکن جس طرح زود نویسی، غیر معیاری ادب کی ضمانت نہیں ہوتی ہے، اسی طرح سے کچھوے کی رفتار سے لکھنے والے ادیب ہمیشہ قابل برداشت تخلیق سے نوازتے ہوں، یہ بھی ضروری نہیں ہے۔ یقین نہ آئے تو اسی کتاب کو پڑھ لیجیے۔

میر تقی میر نے جس طرح دِلّی کو کئی مرتبہ اپنی آنکھوں کے سامنے اجڑتے دیکھا تھا، میں نے کم و بیش پچھلے تیس برسوں میں اسی طرح سے ہندوستان میں اردو طنز و مزاح

کو بار بار بنتے بگڑتے دیکھا ہے بلکہ اس میں بہ نفس نفیس شرکت بھی کی ہے۔ وہ تو بھلا ہو جناب یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کا جنہوں نے مزاحیہ ادب کو قصہ پارینہ ہونے سے اب تک بچا رکھا ہے۔ اُدھر حیدر آباد میں مجبی مصطفیٰ کمال ''شگوفہ'' کے ذریعے اس شمع کو جلائے رکھنے میں اب تک تقریباً کامیاب ہیں۔ دراصل طنزیہ و مزاحیہ ادب ظاہری طور پر جتنا نازک اور رقیق القلب معلوم ہوتا ہے، باطنی طور پر اتنا ہی سخت جان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد کئی نشیب و فراز دیکھنے کے باوجود یہ لبوں پر مسکراہٹ سجائے اور آنکھوں میں آنسو چھپائے ہمیں زمانے کے سرد و گرم سے بچائے ہوئے ہے۔

سولہ برس پہلے جب میری پہلی کتاب ''قند و زقند'' منظر عام پر آئی تھی تو اُن دنوں میں سال بھر میں ایک مضمون کے اوسط سے لکھ رہا تھا اور آج جبکہ دوسری کتاب شائع ہو رہی ہے (جس کا نام سوائے ''قندِ مکرّر'' کے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا) تب بھی کم و بیش یہی اوسط قائم ہے۔ کم لکھنے کے لئے جتنی مشقت اور ریاضت درکار ہوتی ہے، اس سے وہی لوگ واقف ہیں جو بہت زیادہ لکھتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو دوسروں کے لئے لکھتے ہیں۔ پچھلے سولہ برسوں میں پُل کے نیچے سے کافی پانی بہہ چکا ہے۔ پہلے سماج کی ناہمواریوں پر لکھا بھی جا سکتا تھا اور دوسروں کو ہنسایا یا رُلایا بھی جا سکتا تھا۔ آج کھلی معیشت اور عالم گیریت کے دور میں وہی ناہمواریاں ہماری ضرورت اور عادت بن گئی ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ دس پندرہ برس پہلے کا مزاحیہ ادب بھی ''کلاسک'' کا مرتبہ حاصل کر چکا ہے۔ اس لئے کہ نئی نسل کے نزدیک ''کلاسک'' وہ ہے جو ان کے کام کا نہیں رہا۔ پُرانی نسل بھی ان سے کچھ کم نہیں ہے۔ وہ بیسویں صدی میں جن چیزوں کو استہزائیہ نظروں سے دیکھتی تھی (جیسے موبائیل، برگر، جینس، امپورٹڈ کار)، آج ان ہی چیزوں کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہے۔ اس لئے اگر اس کتاب کے کچھ مضامین آپ کو پُرانے دور کے معلوم ہوں تو مصنف کو یہ سوچ کر معاف کر دیں کہ مضامین تو اپنے وقت پر لکھ بھی دئے گئے تھے اور رسالوں میں شائع بھی ہو گئے تھے۔ مگر آپ کو ان تک پہنچنے میں قدرے تاخیر ہو گئی ہے۔ یوں بھی آج کی تیز رفتار دنیا میں

روزانہ بدلنے والی اشیاء اور افراد پر فوراً مضمون لکھ کر قاری تک نہ پہنچا دیا جائے تو اشیاء کے نئے ماڈلز آجاتے ہیں اور لوگوں کی ضرورتیں بدل جاتی ہیں، یہاں تک کہ افراد کے کردار تک رنگ بدلنے لگتے ہیں اور خاکہ نگار ہاتھ ملنے لگتا ہے۔

کمپیوٹر، ویب سائٹ اور انٹرنیٹ کے اس دور میں پلک جھپکتے ہی دنیا بھر کی معلومات کا خزانہ ہماری جھولی بھر دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کتاب کی اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے، خصوصاً تخلیقی شہہ پاروں کی اہمیت گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی ہے اور اسی لئے دنیا بھر میں کتابوں کی فروخت میں اضافہ ہوا ہے۔ جہاں تک طنزیہ و مزاحیہ ادب کا تعلق ہے، اسے قاری کی تلاش میں کبھی بھٹکنا نہیں پڑتا ہے اور آج بھی جب کہ ہمارے ملک میں طنز و مزاح لکھنے والے ادیبوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، اس کے پڑھنے والوں کی تعداد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ سپلائی اور ڈیمانڈ کے اس عدم توازن کے سبب ممکن ہے، ہندوستانی روپے کی قیمت بڑھ رہی ہو لیکن ہمارے قارئین کی خوشحالی اور خوش مزاجی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں، یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔

ان حالات میں اگر آپ کو یہ کتاب پسند آتی ہے تو آپ کے زود رنج، رحم دل اور روادار ہونے کا کھلا ثبوت ہے، اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کی حسِ مزاح کا معیار بہت بلند ہے اور ذرا سی کوشش سے آپ مزاح نگاروں کی قلت دور کر سکتے ہیں......

ع : ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

— فیاض احمد فیضی

یکم اپریل ۲۰۰۸ء، ممبئی

مقدمہ فلمی شعروشاعری

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دُکان سب سے الگ

تمہید:۔
فی زمانہ اس روئے زمین پر سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ اپنے لیے اِسی دنیا میں جنت آباد کی جائے، چاہے اِس کے لیے ہمیں دوسروں کو جہنم میں کیوں نہ جھونکنا پڑے۔ اسی عظیم مقصد کو پانے کے لیے انسان کے مختلف گروہ اپنے اپنے مذاق اور استعداد کے موافق جدا جدا کاموں میں مصروف ہیں اور دوسروں کی کوششوں سے اپنی ضرورتیں رفع کرتے ہیں تاکہ اپنا کوئی کام اٹکا نہ رہے۔ اگرچہ اُن میں بعض افراد اور جماعتوں کے کام ایسے احمقانہ بھی ہیں جو سوسائٹی کے حق میں سودمند ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے پاس عقل سلیم کی کمی اور بدقسمتی کی فراوانی ہے، اس لیے یہ اپنی بیوقوفیوں پر قانع اور خوش رہتے ہیں اور بغلیں بھی بجاتے ہیں۔ مگر خدائے بزرگ و برتر کا بڑا احسان ہے کہ سوسائٹی میں ایسے افراد اور ایسی جماعتوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اور نمک بھی اتنا کم جتنا بلڈ پریشر کے مریض استعمال کرتے ہیں۔

چھوٹا کسان اپنی کوشش سے بڑے کسانوں اور زمینداروں کے پیٹ اور تجوریاں بھرتا ہے اور اپنے خالی پیٹ کو پکڑ کر اور اپنے خالی سر کو کھجاتے ہوئے سوچتا ہے

کہ وہ ایک عالم کی پرورش کرتا ہے۔ شہر میں مزدور اپنے بیوی بچوں سمیت زیرِ تعمیر عمارتوں میں اینٹیں ڈھوتا ہے اور یہ سوچ کر خوش ہوتا ہے کہ اُس کے بنائے ہوئے مکانات سے لوگ گرمی، مینہ اور آندھی کی گزند سے بچتے ہیں اور نہیں جانتا کہ اس کے بوجھ ڈھونے کے عمل سے بلڈر کیسے راتوں رات کروڑوں اور اربوں سے کھیلنے لگتا ہے، اور سرکاری محکموں کے نہ جانے کتنے افسر خوشحالی کے پالنے میں جھولنے لگتے ہیں۔ ایک بانسری بجانے والا جو کسی سنسان ٹیکرے پر تن تنہا بیٹھا بانسری کی لَے سے دل بہلاتا ہے، اپنے اس بیکار مشغلے کو نادان کسان اور مزدور کے مشغلے سے کچھ کم ضروری اور مفید نہیں سمجھتا اور نہیں جانتا کہ بمبئی کی فلمی نگری میں کیسے کیسے بے سُرے اور بے ہنر سازندے، میوزک ڈائرکٹر بنے دوسروں کی دُھنیں چرا کر کروڑوں میں کھیل رہے ہیں اور اُن نئی گلوکاراؤں سے اپنا جی بہلا رہے ہیں جو 'پلے بیک سنگر' بننے کا خواب لے کر کسی بھی دُھن پر گانے اور رقص کرنے کے لیے تیار رہتی ہیں۔

یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ فلمی شاعری اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ جس میں شاعری کا مادہ بالکل نہیں ہوتا ہے، وہی فلمی شاعر بنتا ہے۔ فلمی شاعری کی سب سے پہلی علامت غیر موزونی طبع سمجھی جاتی ہے۔

فلمی شاعری شائستگی کے زمانے میں ترقی پاتی ہے......

فلمی شعر اگر اصلیت کے بالکل خلاف اور محض بے بنیاد ہو تو تاثیر اور دل نشینی اس کے نیچر میں داخل ہے۔ ضرورت سے زیادہ تہذیب یعنی مغربی تہذیب کا اثر فلمی شعر پر بہت اچھا ہوتا ہے لیکن اگر فلمی شاعر کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے اور اس کے علم میں اضافہ ہو جائے تو یہ فلمی شعر کے حق میں سم قاتل ہے۔ جب تک سوسائٹی غیر معمولی مہذب ہو مگر اس کا علم اور واقفیت محدود ہو، اس وقت زندگی خود ایک کہانی معلوم ہوتی ہے......

زندگی اور کچھ بھی نہیں، تیری میری کہانی ہے

......اور فلمی شاعر کے لیے شاعری کا دریا بہا دینے کی آسانیاں از خود پیدا ہو جاتی ہیں۔

فلمی شعر دل پر ویسا ہی پردہ ڈالتا ہے جیسا میجک لینٹرن آنکھ پر ڈالتی ہے، جس طرح اس لالٹین کا تماشہ بالکل اندھیرے کمرے میں پورے کمال کو پہنچتا ہے، اسی طرح فلمی شعر محض تاریک زمانہ میں اپنا پورا کرشمہ دکھاتا ہے۔ اسی لیے فلمیں اندھیرے میں دکھائی جاتی ہیں اور فلمی عشقیہ گیتوں کا مزہ نوجوان جوڑے سنیما ہال کی سب سے پچھلی نشست پر آنکھیں بند کر کے اُٹھاتے ہیں۔

فلمی شاعری کا تعلق اخلاق کے ساتھ......

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کلاسیکی، ادبی اور غیر فلمی شعر سے نفسانی جذبات کو اشتعال انگیزی کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ مثلاً......

منہ دکھا دیتے ہو جوبن تو دکھاتے بھی نہیں

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

اس کے برخلاف فلمی شاعری سے روحانی خوشیاں اور سائنسی فکریں بیدار ہوتی ہیں جن کو بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی ہم یہاں ایک مثال دیتے ہیں تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ فلمی شاعر بوالہوس نوجوانوں کو سمجھاتا ہے کہ محبوب اپنے دل کو چھپانے کی خاطر چولی دامن کا سہارا لیتا ہے تا کہ اس کے دل کا حال عاشق کو معلوم نہ ہو جائے کہ اس میں سوائے شریانوں اور وریدوں کے کچھ نہیں ہوتا جو صاف خون لانے اور گندہ خون لے جانے کے عمل میں بالترتیب مصروف رہتی ہیں۔ مگر ہم اپنی کم نگاہی کے سبب محبوب کے دل کی دھڑکنوں کو سن نہیں پاتے۔

اگر افلاطون کے خیالی کانسٹی ٹیوشن کے مطابق تمام فلمی شاعروں کو جلاوطن کر دیا جائے تو یہ قوم کو اخلاقی پستی کی طرف لے جائے گا اور ایک سرد مہر، خودغرض اور بے مروت سوسائٹی قائم ہو جائے گی، کیونکہ جب تک فلمی شاعری کا رواج ہے، ہماری قوم اخلاق اور کردار کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہے گی۔

یوں تو پرانے زمانے کی غیر فلمی اور ادبی شاعری میں بھی اخلاقیات کے درس کبھی

بھی دیئے گئے مگر ہماری قوم پر ان کا مطلق اثر نہیں ہوا اور اس نے اپنی پُرانی روش نہیں چھوڑی۔ ہم اخلاقیات اور تعلیمی درس سے معمور ایک شعر پیش کرتے ہیں ......

اکہتر، بہتر، تہتر، چوہتر
پچھتر، چھہتر، ستتر، اٹھتر

اس پُراثر شعر میں شاعر بہتر فرقوں میں بٹی اپنی قوم سے مخاطب ہوکر کہہ رہا ہے کہ تم اکہتر سے بہتر فرقوں میں بٹ گئے۔ خدا کے لیے اس سلسلے کو روکو ورنہ تم تہتر، چوہتر، پچھتر، چھہتر، ستتر، اٹھتر اور نہ جانے کتنے فرقوں میں منتشر ہو جاؤ گے اور غیر قومیں تمہارے اس انتشار کا فائدہ اُٹھائیں گی اور تمہارے زوال کا سبب بنیں گی۔ ہمیں اس شعر کے خالق کی نیت پر ذرا سا بھی شک نہیں۔ بحر، وزن، قافیہ، ردیف، ہر چیز کا خیال اس شعر میں بحسن وخوبی رکھا گیا ہے۔ لیکن شاعر شعر کہتے وقت بھول گیا کہ اس کی قوم کے بیشتر افراد ناخواندہ ہیں (دیکھئے سچر کمیٹی رپورٹ)۔ اگر اس شعر کے پڑھنے والے کو ایک سے ستر تک گنتی نہ آتی ہو تو وہ کیسے اس شعر کا لطف اُٹھائے گا اور اس کی تعلیمی اور اخلاقی سطح کیسے بلند ہوگی؟

لیکن خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے فلمی شاعروں کے دل میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ چنانچہ اس کمی کو دَورِ جدید کے فلمی شاعروں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا، ان کا دل قوم کی جہالت اور ناخواندگی پر تڑپا اور انہوں نے کہا......

ایک دو تین/ چار پانچ چھ سات آٹھ نو/ دس گیارہ بارہ تیرہ/ تیرا کروں دن گن کے انتظار/ آجا پیا آئی بہار

اس سبق آموز تعلیمی اور درسی گیت سے ہماری قوم کے نونہالان نے بآسانی گنتی بھی سیکھ لی اور اپنے پسندیدہ موضوع یعنی عشق ومحبت کا نغمہ بھی سن لیا۔ آج جبکہ اسکولوں میں سیکس ایجوکیشن کی باتیں کی جارہی ہیں، ہم اس کی ابتداء اس قبیل کے تعلیمی عشقیہ گیتوں سے کرسکتے ہیں اور پروجیکٹر کی مدد سے بچوں کو گیت کے ساتھ فلمی ہیروئین کا ہیجان انگیز اخلاقی رقص بھی دکھا سکتے ہیں۔

شعر کی تعریف......

شعر کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں اور ہر تعریف قابل تعریف ہے، لیکن فلمی شاعری کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کی کوئی تعریف متعین نہیں کی جاسکتی۔ فلمی شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ غزل کے حصار سے باہر نکل آئی ہے اور آزاد غزل، غزل نما اور نثری نظم سے ملتی جلتی کوئی شئے معلوم ہوتی ہے۔ فلمی شاعر بننے کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ آپ کو نثر لکھنا آتا ہو نہ نظم لکھنا۔ فلمی شاعروں کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ نقاد فلمی شاعری کی بہت اچھی سمجھ رکھتے ہیں، اس لیے وہ ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھتے۔ اسی طرح سے فلمی شاعری کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ شاعر بڑی آسانی سے خود کو غالبؔ، میر اور اقبالؔ کا ہم پلّہ شاعر قرار دے سکتا ہے۔ اگر یہی اعلان کوئی غیر فلمی شاعر کرے تو لوگ اُس کو بشیر بدرؔ کے معیار کا شاعر سمجھیں گے۔ کامیاب فلمی شاعر جب کوئی ایسا دعویٰ کرتا ہے تو لوگ سچ مچ اُسے غالبؔ و میرؔ کا جانشین سمجھ کر آٹو گراف اور انٹرویو لینے دوڑ جاتے ہیں، کیونکہ لوگ...... اور خاص طور پر میڈیا کے لوگ جانتے ہیں کہ فلمی شاعری اتنا مشکل کام ہے کہ غالبؔ جیسا بڑا شاعر بھی فلموں کے لیے سات آٹھ نغموں سے زیادہ نہیں لکھ سکا۔ فلمی شاعروں کی عظمت کا ایک جیتا جاگتا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے کبھی دولت کا سہارا لے کر اپنی شخصیت اور خدمات کے موضوع پر کسی غریب اور خوبصورت طالبہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی نہیں کروائی۔ ورنہ وہ چاہتے تو یہ کام اپنے صرف ایک فلمی گیت کے معاوضہ کے عوض کرا سکتے تھے۔

فلمی شاعری کے لیے کیا کیا شرطیں ضروری ہیں......؟

اب ہم چند مثالوں سے فلمی شاعر اور غیر شاعر کے نازک رشتہ کو ظاہر کریں گے۔ اب ہم کو یہ بتانا ہے کہ فلمی شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے کون سی شرطیں غیر ضروری ہیں اور فلمی شاعر میں کون سی خاصیتیں ہیں جو اُس کو غیر شاعر کا ہم پلّہ بناتی ہیں۔

تخیل......

تخیل ایک ایسی قوت ہے کہ جس فلمی شاعر میں جس قدر اعلیٰ درجے کی ہوگی، وہ اتنا ہی ناکام شاعر ہوگا اور جس قدر یہ ادنیٰ درجے کی ہوگی، اس کی فلمی شاعری اتنی ہی کامیاب اور ہٹ ہوگی۔ حالی کا قول ہے کہ تخیل وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لے کر نکلتا ہے اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے کچھ مائیں بچے کی پیدائش کے فوراً بعد اُسے بھی بچے کی ناف کے ساتھ کاٹ کر زمین میں دفن کر دیتی ہیں تاکہ وہ بڑا ہو کر فلمی شاعر ہی نہ بننے پائے۔ لیکن پھر بھی اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایک بہت مشہور غیر فلمی شعر ہے......

تم مخاطب بھی ہو، قریب بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

اس شعر میں شاعر کے تخیل اور خود شاعر کی کمزوری ملاحظہ فرمایئے کہ اول تو محبوب شاعر کے قریب نہیں آتا کہ شاعر کے لباس سے اُٹھنے والی ایک مخصوص مہک اُسے ایسا کرنے سے روکتی ہے۔ دوسرے محبوب عام طور پر شاعر کو مخاطب بھی نہیں کرتا اور اگر کوئی ضروری بات کہنی بھی ہو، جیسے ...... ''بابا، معاف کرو'' یا ''میری نظروں سے دُور ہو جاؤ'' وغیرہ، تو دُور ہی سے بات کرنے میں محبوب اپنی عافیت سمجھتا ہے۔ بالفرض محال محبوب بائیں بازو سے تعلق رکھتا ہے اور مفلسوں سے ہمدردی جتانے کو اپنی پارٹی کے حکم کے مطابق ضروری سمجھتے ہوئے قریب آ کر بات کر بھی رہا ہے تو شاعر کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ موقع نہ اُسے دیکھنے کا ہے نہ بات کرنے کا، بلکہ یہ موقع سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ہے۔ اس شعر میں شاعر کا تخیل بالکل ناکام ہے۔ اس کے برعکس ایک فلمی شاعر کے ادنیٰ تخیل کی اونچی اُڑان ملاحظہ فرمایئے......

تو میرے سامنے/ میں تیرے سامنے/ تجھ کو دیکھوں کہ پیار کروں/ یہ کیسے ہو گیا تو میری ہو گئی/ کیسے میں اعتبار کروں...... ٹوٹ گئی ٹوٹ کے میں چور ہو گئی/ تیری ضد سے مجبور ہو گئی/ تیرا جادو چل گیا او جادوگر......

دیکھئے شعر کو مکالمے کی شکل دے کر ان بے ترتیب مصرعوں میں کتنی خوش اسلوبی سے شاعر نے محبت کے تمام مراحل طے کر لیے ہیں۔

غیر فلمی شاعری کا مطالعہ......

فلمی شاعر کے لیے ازبس ضروری ہے کہ وہ اور کچھ پڑھے نہ پڑھے، روزانہ اخبار ضرور پڑھے تاکہ کم از کم اخباری زبان سے اس کی واقفیت رہے۔ نئی نسل کے لیے مخصوص نغمے تحریر کرنے کے لیے ٹی۔وی چینلوں پر بولی جانے والی ''جذباتوں، الفاظوں، حالاتوں''، والی زبان جاننا بھی بے حد ضروری ہے۔ فلمی شاعر اپنی بیکاری کے زمانے میں البتہ کبھی کبھی غیر فلمی استاد شعراء کا کلام محض اس نیت سے اور یہ جاننے کے لیے پڑھتا ہے کہ وہ ان سے بہتر کیسے لکھ سکتا ہے۔ اب جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی نظم ''فاختہ کی آواز'' میں یہ مصرعے لکھے......

جیسے یعقوب غرق شیون میں
جیسے سیتا کی جستجو بن میں
جیسے وادی میں دھیمی دھیمی پھوار
جیسے جو بر نہ آئی ہو وہ مراد
جیسے بچھڑے ہوؤں کی دل میں یاد
جیسے اشکوں کی لہر سینے میں

......تو ہمارے فلمی شاعر نے ان بے رس اور پھیکے سیٹھے مصرعوں کے مقابلے میں گیت لکھا تو جوش کی روح کے ہوش اُڑ گئے اور فلمی نغموں کی مقبولیت کے سب ریکارڈ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے......

ایک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا/ جیسے کھلتا گلاب/ جیسے شاعر کا خواب/ جیسے اجلی کرن/ جیسے بن میں ہرن/ جیسے چاندنی رات/ جیسے نغمے کی بات/ جیسے مندر میں ہو......ایک جلتا دیا۔

آخری مصرعے میں لفظ 'ہو' کی معنویت ملاحظہ فرمائیں کہ ہو کو آپ جتنا کھینچ کر پڑھتے ہیں، دیے کی لَو اُتنی ہی تیز ہوتی جاتی ہے۔

فلمی شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں......؟

ملٹن نے لکھا ہے کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔ اب ہم آپ کو ایک نہیں، دو اشعار سناتے ہیں......

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن آئے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اور یہ بھی دیکھئے......

نہ سیر باغ، نہ ملنا، نہ میٹھی باتیں ہیں
یہ دن بہار کے اے جان! مفت جاتے ہیں

اب ہمارے فلمی شاعر نے کتنی سادگی سے ان دو اشعار اور ایسے نہ جانے کتنے اشعار کے موضوعات کو اپنے فلمی نغمے کے صرف مکھڑے میں سمیٹ دیا ہے۔ سنئے اور سر دُھنیے......

اے کیا بولتی تو / اے کیا میں بولوں / سن / سنا / آتی کیا کھنڈالا / کیا کروں
آکے میں کھنڈالا / ارے گھومیں گے پھریں گے ناچیں گے گائیں گے عیش
کریں گے اور کیا

اس دلکش مکھڑے کے آخری مصرعے میں 'اور کیا' کا ٹکڑا بہت ہی بلیغ ہے اور عاشق اپنے محبوب کو اشارہ کر رہا ہے کہ کھنڈالا جانے کے باوجود صرف عیش کرنا چاہتا ہے، عیاشی نہیں...... اور اس طرح شاعر نے نئی نسل کی بے راہ روی پر لگنے والے الزامات کا بڑی کامیابی سے دفاع کیا ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے......

نہیں مجھے جستجوئے منزل کہ خود ہے منزل مری طلب میں
کوئی تو مجھ کو بلا رہا ہے کسی طرف کو تو جا رہا ہوں

اس شعر کو پڑھ کر مطلق سمجھ نہیں آتا کہ شاعر کہاں جا رہا ہے، کون اُسے بلا رہا ہے اور اس کی منزل کہاں ہے۔ لیکن فلمی شاعر کو دیکھئے، کتنی سادگی، جوش اور اصلیت کے ساتھ اپنی منزل کو چیلنج کر رہا ہے......

میں تو رستے سے جا رہا تھا/ میں تو سیٹی بجا رہا تھا/ میں تو بھیل پوری کھا رہا تھا/ تجھ کو مرچی لگی تو میں کیا کروں؟

فلمی شعراء کے ہاں ایسے بے شمار اشعار ہیں جن میں معمولی خیالات، سادگی اور صفائی کے ساتھ نرالے اسلوب میں بیان ہوئے ہیں کہ ان کا مقابلہ غالبؔ کے اشعار بھی نہیں کر سکتے۔ اب مرزا غالبؔ کے اسی شعر کو لیجیے......

وہ بادۂ شبانہ کی اب سرمستیاں کہاں

اُٹھیے، بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

اس شعر کو سمجھنے کے لیے غالبؔ کے متعدد شارحین سے الجھنا پڑتا ہے، مگر دیکھیے، ہمارے فلمی شاعر نے اس شعر کی کتنی آسان تشریح اپنے اس گیت میں کر دی ہے......

رات کا نشہ ابھی آنکھ سے گیا نہیں/ تیرا نشیلا بدن باہوں نے چھوڑا نہیں/ آنکھیں تو کھولیں مگر سپنا وہ توڑا نہیں/ ہاں وہی وہ وہی سانسوں پر رکھا ہوا/ تیرے ہونٹوں کا سپنا ابھی ہے وہی

نیچرل شاعری......

نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً اور معناً دونوں حیثیتوں سے نیچرل یعنی بدنصیب شاعر کی فطرت یا عادت یا حیثیت کے مطابق ہو۔ مومنؔ کا شعر ہے......

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

بقول حالیؔ، یہ بھی نیچرل شعر سمجھا جائے گا کیونکہ جس سے تعلق خاطر بڑھ جاتا ہے یا بڑھا لیا جاتا ہے، اس کا تصور تنہائی میں ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ جب تک کہ کوئی اور اس

تنہائی کو دُور کرنے کے لیے چھم سے نہ چلا آئے۔ ہمارا اس شعر پر اعتراض یہ ہے کہ جب شاعر اور محبوب دونوں موجود ہیں اور تیسرا کوئی نہیں ہے تو نیچرل شعر یوں ہونا چاہیے……

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی تیسرا نہیں ہوتا

یہ شعر سہل ممتنع کی بھی ایک اچھی مثال ہے۔ اس لیے کہ سہل ممتنع کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر شعر کو نثر میں تبدیل کیا جائے تو لفظوں کی ترتیب میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ ہمارے فلمی شاعر سہل ممتنع اور نیچرل شاعری دونوں میں بے مثال مہارت رکھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے……

کسی ڈسکو میں جائیں/ کسی ہوٹل میں کھائیں/ کہیں گھوم کے آئیں/ چلو عشق لڑائیں/ چلو عشق لڑائیں صنم……

اب ہم اس شیطان کی آنت مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ یہ خیال کرنا فضول ہے کہ جو کچھ اس میں لکھا گیا ہے وہ سب واجب التسلیم ہے۔ اس خیال سے کہ ہمارے ہم وطن فلمی شاعر ابھی اعتراض سننے کے عادی نہیں ہیں، بلکہ تنقید کو تنقیص سمجھتے ہیں۔ اس مضمون میں کسی خاص فلمی شاعر کے کلام پر کوئی گرفت یا اعتراض نہیں کیا گیا ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ شاعری کے اصول سے ناواقف ہے یا اس نے کوئی گریمر یا عروض کی غلطی کی ہے۔ یوں بھی فلمی شاعری کی کوئی گریمر نہیں ہوتی ہے، اسی لیے یہ اسکولوں میں پڑھائی نہیں جاتی اور فلمی شاعر کبھی اسکول کا رُخ نہیں کرتے۔ بایں ہمہ اگر بشری تقاضے کے سبب کوئی ایسی بات لکھی گئی ہو جو ہمارے کسی ہم وطن فلمی شاعر کو ناگوار گزرے تو ہم نہایت عاجزی اور ادب سے معافی کے خواستگار ہیں کیونکہ ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں اس مضمون کی پاداش میں ہمارا اپنا ہی کوئی رفیق فلمی گیت کار طیش میں آ کر ہمیں مولانا حالیؔ کے پاس ہی نہ بھیج دے۔ ویسے ہمیں قبل از وقت مولانا حالیؔ کے پاس جانے پر بھی اعتراض نہیں لیکن ڈر اس بات کا ہے کہ ہمارے ہم وطن فلمی شاعر کو اس کارنامے کے عوض جلاوطنی اختیار کر کے لندن میں گوشہ عافیت وندامت تلاش کرنا ہوگا۔ ہم اپنے تمام ہم

وطن فلمی شعراء کو یقین دلاتے ہیں کہ اس مضمون کو صفحہ قرطاس کی زینت بناتے وقت ہمارا مقصد وہی تھا جو ایک بہت بڑے فلمی شاعر نے یوں نظم کیا ہے......

اک پل کا ہے جینا / پھر تو ہے جانا / تحفہ کیا لے کے جایئے / دل یہ بتانا / خالی ہاتھ آئے تھے ہم / خالی ہاتھ جائیں گے / بس پیار کے دو میٹھے بول جھلملائیں گے / تو ہنس کیونکہ دنیا کو ہے ہنسانا / اے میرے دل تو گائے جا / اے آ اے آ، او آ اے آ۔

OO

ممبئی جو اِک شہر ہے

اگر آپ عروس البلاد ممبئی شہر کے نقشے کو غور سے دیکھیں تو اس میں اور عاشق کے پیرہن میں حیرت انگیز مماثلت نظر آئے گی۔ گریباں چاک اور دامن ایک طرف سے پھٹا ہوا تو دوسری طرف سے تار تار۔ آپ کہیں گے شہروں کی دلہن اور عاشق کے پیرہن میں کیسی مماثلت......؟ تو جناب یہی تو تازہ ترین فیشن ہے کہ دلہن بھی اب جینس اور کرتا پہنے رجسٹرار کے آگے جھکی نظر آتی ہے اور یہ کرتا یا پیرہن بھی نیشنل پارک کی طرح کھلا کھلا اور وہار لیک کی طرح تازہ، خنک ہوا سے بھرپور۔ دامن کے چاک یعنی قلابہ اور گریبان کے چاک یعنی دہیسر کے درمیان تقریباً پچاس کلومیٹر کا فاصلہ ہے جس نے کسی بھی فصل بہار میں کم نہ ہونے کی قسم کھائی ہے۔ کتنے ہی فلائی اوور بن جائیں، زمین دوز اور سمندری راستے تلاش کر لیے جائیں، آبادی اور ٹریفک اس سے زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کر کے ہر حکمت عملی کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ پھر بھی حکومت ہمت نہیں ہارتی، وہ انسانوں اور موٹر گاڑیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر پابندی بھی نہیں لگاتی اور عظیم گلوکارہ لتا منگیشکر کو منانے کی کوششیں بھی جاری رکھتی ہے تاکہ پیڈر روڈ پر مزید ایک فلائی اوور وجود میں آجائے۔

ممبئی شہر جنوب سے شمال تک (کی طرف) دو متوازی خطوط میں میاں بیوی کی طرح الگ الگ آگے بڑھتا ہے۔ ایک چرچ گیٹ سے دہیسر کی طرف تو دوسرا شیوا جی ٹرمنس سے ڈومبیولی کی جانب۔ درمیان میں کہیں یہ زن و شوہر غلطی سے دادر میں ایک

دوسرے کو چھو جائیں تو فوراً الگ ہو جاتے ہیں اور پھر اپنی راہ لیتے ہیں۔ ان میں ایک خط کا نام ویسٹرن ریلوے لائن ہے، تو دوسرا سنٹرل ریلوے لائن کہلاتا ہے۔ ان دونوں کی ایک نکمی اور نالائق مگر قدرے مفید اولاد بھی ہے جو ہاربر لائن کہلاتی ہے اور جو شیواجی ٹرمنس کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھتی ہے اور والدین کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کبھی راستہ بھٹک کر نئی ممبئی کی طرف نکل جاتی ہے تو کبھی باندرہ اور اندھیری سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ راستے میں تھک کر بیٹھ جانا، ذرا سی برسات سے ناراض ہو جانا، بار بار علاج اور مرمت کے بہانے کام سے جی چرانا اس لائن کی فطرت ہے۔ ان سب کے باوجود ان تینوں لائنوں پر ٹہلنے والی ٹرینوں کی خدمات کا یہ عالم ہے کہ ہندوستان بھر میں ان کا شہرہ ہے اور یہ ممبئی شہر کی شہ رگ کہلاتی ہیں۔ یہ کام کرنا بند کر دیں تو شہر کے دل کی حرکت رک جاتی ہے اور بچے اس خوشی میں سڑکوں پر کرکٹ کھیلنے لگتے ہیں۔

ممبئی شہر کا نام ممبا سے مستعار لیا گیا ہے جسے برادران وطن ممبا دیوی یا ماں (مراٹھی میں آئی) کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ سنا ہے جب بیسویں صدی سولہ کے سن پر پہنچی تھی اور اس کا عالم شباب تھا، تب پرتگیزیوں نے اس علاقے کو بوم باہیا (Bom Bahia) یعنی اچھا سمندر (Good Bay) کا نام دیا تھا لیکن جس طرح سے ہمارے ہاں خوبصورت بچوں کے نام گھر والے بڑی محنت اور محبت کے ساتھ بگاڑتے ہیں اور اسے نظر کے ٹیکے کی طرح استعمال کرتے ہیں، اسی طرح بوم باہیا بگڑ کر بوم بیم (Bom Baim) ہو گیا جو آج بھی پرتگالی زبان میں رائج ہے۔ اس کے بعد جب ہم نے اپنی نااہلی سے تنگ آ کر اپنا ملک انگریزوں کو چند سو برسوں کے لیے لیز (Lease) پر دے دیا تاکہ اس نظام کو وہ خوش اسلوبی کے ساتھ چلائیں، تو انہوں نے بام بیم کا فرنگی نام بامبے (Bombay) کر دیا لیکن انگریزوں کی واپسی کے ۴۵ ربرسوں بعد دسمبر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کو مسمار کر دیا گیا اور بامبے فسادات اور بامب بلاسٹ کی زد میں آ گیا۔ منی رتنم نے "بامبے" فلم بنا کر شہرت اور دولت، دونوں کما لیے اور شیو سینا ممبئی فسادات کا سہرا اپنے سر باندھے، حکومت بنانے میں کامیاب بھی ہو گئی تو ۱۹۹۵ء میں اعلان کر دیا گیا کہ

اب اس شہر کے نام سے بم (Bomb) اور سمندر (Bay) دونوں ہی کا تعلق نہیں رہے گا اور اسے سرکاری طور پر ممبئی کہا جائے گا۔ پھر بھی کچھ انگریزوں کے وفادار افراد اور ادارے اسے آج بھی بامبے کہنے پر مصر ہیں۔

نام کی تبدیلی کے بعد گلوبلائزیشن کے اس دور میں جو نئی نسل ایک ہاتھ میں پیزا (Pizza) اور برگر (Burger) اور دوسرے ہاتھ میں موبائیل لیے پیدا ہوئی ہے، اسے قطعی نہیں معلوم کہ اس کے آبا واجداد اس شہر کو ''شہروں کی دلہن'' کہا کرتے تھے جس کی خوبصورتی اور بدصورتی، دونوں میں پچھلے سو برسوں میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ یہ شہر پہلے سات جزیروں پر مشتمل تھا جو پتھروں کے زمانے (Stone Age) سے آباد ہے۔ دو سو پچاس سال قبل مسیح کی دستاویزات (جو ہم نے نہیں دیکھیں) کے مطابق اسے ہیپ تانیشیا (Heptanesia) یعنی ''سات جزیروں کا مجموعہ'' کہا جاتا تھا جو اشوک اعظم کے زمانے میں موریہ سلطنت کا حصہ تھا اور اب جدید پتھروں کے زمانے میں جب سنگدلی عام ہے، یہ ریاست مہاراشٹرا کا مرکز اور ہمارے ملک کی تجارتی راجدھانی ہے جسے بحر عرب نے ایک طرف حسن کی دولت بخشی ہے تو دوسری طرف ایک اہم بندرگاہ کی شکل میں اسے کروڑوں اربوں کی مستقل آمدنی سے مالا مال کر رکھا ہے۔ ممبئی یونیورسٹی کی وجہ سے یہاں علم کا دریا بھی رواں دواں رہتا ہے، جس میں تیرنے اور ڈوبنے والے تو کم ملیں گے، البتہ اس کے کنارے سے ڈگریوں کی سیپیاں جمع کرنے والے لاکھوں کی تعداد میں نظر آئیں گے۔ ایسی دلہن جس کے پاس حسن، دولت اور علم، تینوں وافر مقدار میں ہوں، حقیقی زندگی میں صرف خوابوں میں ملا کرتی ہے۔

آج سے ٹھیک سو برس پہلے یعنی ۱۹۰۶ء میں، جب ہم اور آپ پیدا نہیں ہوئے تھے، ممبئی کی آبادی بڑھ کر دس لاکھ ہوگئی تھی تو بڑا شہرہ تھا کہ کلکتہ کے بعد آبادی کے لحاظ سے اس شہر نے دوسرا مقام حاصل کرلیا ہے۔ پھر ستر کی دہائی کے اواخر میں شور اُٹھا کہ لو! ممبئی نے آبادی کے معاملے میں کلکتہ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ پھر ممبئی شہر نے ایک کروڑ کے نشانے کو پار کرلیا تو ایک مرتبہ پھر شور اُٹھا جسے کسی نے بھی نہیں سنا کہ صوتی آلودگی اس شہر

کی اتنی بڑھ چکی ہے اور خود آدمی کی ذات کے اندر اتنا شور بڑھ گیا ہے کہ اب کوئی صدا اسے سنائی نہیں دیتی۔ اب تو سنا ہے کہ ممبئی کی اصل آبادی کسی کو نہیں معلوم، بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ پونے دو کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے اور کسی بھی دن دو کروڑ ہو جائے گی۔ اس کثیر آبادی کے مسئلہ کے اندرون میں ایک اور ضمنی مسئلہ یہ بتایا جاتا ہے کہ یہاں ہر ایک ہزار مردوں کے لیے صرف ۸۱۱/ عورتیں ہیں۔ ہمیں ان بقیہ ۱۸۹/ مردوں کی قسمت پر رشک آتا ہے جنہیں تنگ کرنے کے لیے اس شہر میں کوئی عورت نہیں ہے۔

ہم نے تاریخی کتابوں کے آلودہ ہونے سے بہت پہلے پڑھا تھا کہ ممبئی نے تحریک آزادی میں بھی اہم رول ادا کیا ہے اور مہاتما گاندھی نے یہیں ۱۹۴۲ء میں انگریزوں کو ''ہندوستان چھوڑ دو'' کے نعرے سے للکارا تھا۔ آج اگر مہاتما گاندھی زندہ ہوتے تو ممبئی کی آبادی سے پریشان ہو کر ہندوستانیوں کو ''ممبئی چھوڑ دو'' کا نعرہ ضرور دیتے۔ انہوں نے ایک مرتبہ ممبئی کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ممبئی اپنی عمارتوں اور اپنی دولت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنی فیاضی اور سخاوت کی وجہ سے خوبصورت ہے جو دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ ممبئی کے خیرات اور سخاوت کے جذبے نے اس کے گناہوں کی شدت کو چھپا دیا ہے۔

اب ہم گاندھی جی کے قول کے آگے کیا کہیں، یہ سبھی جانتے ہیں کہ ممبئی کے مخیّر حضرات اتنی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں جس سے ممبئی کے علاوہ ملک بھر کے ضرورتمند مستفیض ہوتے ہیں، بلکہ کبھی اس کا فیض وہ لوگ بھی اُٹھا لیتے ہیں جو زکوٰۃ جمع کرنے کو ایک ہنر اور فن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ تجارتی ذہن بھی رکھتے ہیں اور عدیم الفرصت بھی ہیں اور ان ہی دونوں اسباب سے یہ امن پسند ہو گئے ہیں۔ روزی روٹی کی خاطر آٹھ دس گھنٹے کی دوڑ دھوپ اور چار گھنٹے لوکل ٹرین میں بتانے کے بعد اُن کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا کہ وہ لڑائی جھگڑے کے بارے میں سوچیں۔ ۱۹۸۴ء میں فرقہ وارانہ فسادات کے ۹/ سال بعد ۱۹۹۳ء میں فسادات کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ادھر پچھلے ۱۴/ برسوں سے سیاستدانوں نے اس شہر پر اپنی بُری نظر نہیں ڈالی ہے اور یہ فسادات سے بچا ہوا ہے۔ ممبئی کے مجرم اور گناہ گار بھی نسبتاً کافی شریف ہیں اور وہ یہاں اوسطاً ہر

ماہ صرف دو ہزار جرائم کرتے ہیں جو کہا جاتا ہے پچھلے چند برسوں میں بتدریج کم ہوئے ہیں۔ یعنی مجرموں کی شرافت میں قدرے اضافہ ہوا ہے۔ ممبئی میں جرائم کی اس گھٹتی ہوئی شرح سے گھبرا کر پولیس والے خود بھی جرم کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔

ممبئی میں زیادہ تر لوگ 'بمبیا'' بولی بولتے ہیں جسے ابھی تک زبان کا درجہ اس لیے نہیں ملا ہے کہ اس کے لیے ابھی تک کوئی رسم الخط طے نہیں کیا جا سکا ہے۔ گو کہ اس کی قواعد اور گرامر ہندی اور اردو کی ہے مگر الفاظ مراٹھی، گجراتی، پرتگالی اور انگریزی کے بھی شامل کر لیے گئے ہیں اور اسے مزید پُر لطف بنانے کے لیے کچھ مخصوص الفاظ اور اصطلاحات کی ایجاد واختراع بھی کی گئی ہے۔ یہ زبان ممبئی کے علاوہ صرف کامیاب ہندوستانی فلموں میں سنائی دیتی ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان مراٹھی ہے اور پوری ریاست میں مراٹھی کے بعد سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان اردو ہے۔ مراٹھی بولنے والے عام طور پر امیر نہ سہی، ثقافتی طور پر مالا مال ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اردو کی شیرینی کے بہت قائل اور قتیل ہوتے ہیں اور اردو سیکھنے کا شوق رکھتے ہیں۔ دوسری طرف اردو والے جتنی اچھی اردو بولتے ہیں، اس سے کہیں بہتر بمبیا زبان میں مہارت رکھتے ہیں۔ یہ اردو تہذیب کو گلے سے لگائے رکھتے ہیں مگر اس پر اتنا فخر کرتے ہیں کہ مراٹھی سیکھنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ چاہے اس کے لیے انہیں سرکاری ملازمت کے مواقع ہی کیوں نہ گنوانے پڑ جائیں۔

ممبئی اور مہاراشٹرا میں اردو کی تعلیمی صورتحال شمالی اور جنوبی ریاستوں سے بہت بہتر ہے اور یہاں کے نوجوان اردو اسکولوں اور کالجوں سے فارغ ہونے کے بعد شاعری اور افسانہ نگاری نہیں کرتے بلکہ جدید علوم کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے یہاں کے شعراء وادباء کی عمر ۳۵/برس سے زیادہ اور ۸۵/برس سے کم ہے۔

ممبئی کی سب سے انوکھی چیز، یہاں کے کھانے ہیں جو سڑک کے کنارے، کھلے آسمان کے نیچے بھی ملتے ہیں اور ہفت ستارہ ہوٹلوں کے اندھیرے ایئر کنڈیشنڈ ریستورانوں میں بھی۔ ان دونوں مقامات پر کھانے والوں کی بھیڑ دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ یہاں، گھر سے بہتر کھانے ملتے ہیں۔ یہاں آدمی دس روپے روزانہ خرچ کر کے بھی

پیٹ بھر سکتا ہے اور دس ہزار روپے روزانہ کھانے پر خرچ کرنے کے بعد بھی مزید کھانے کی خواہش محسوس کر سکتا ہے۔

یہاں کی دوسری انوکھی شئے یہاں کی فلمیں ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا بلکہ کچھ فلمیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا کوئی جسم بھی نہیں ہوتا۔ جسم کی نمائش البتہ جی کھول کر کی جاتی ہے۔ پھر بھی یہاں روزانہ ایک فلم سے زیادہ کے اوسط سے فلمیں بنتی ہیں اور تماشائی انہیں دیکھ کر بال بچوں سمیت خوش ہوتے ہیں۔ ممبئی میں کچھ ایسے سرپھرے بھی ہیں جنہیں یہ فلمیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس لیے وہ آرٹ گیلریز، میوزیم، تھیئٹر اور کلچرل پروگراموں سے اپنا دل بہلاتے ہیں یا گھنٹوں کسی لائبریری میں بیٹھ کر دماغ کھپاتے ہیں۔ جن لوگوں کو ان میں سے کوئی بھی مشغلہ پسند نہیں ہے وہ دن رات اسٹاک ایکسچینج میں الجھے رہتے ہیں۔ ان کے لیے اسٹاک ایکسچینج روزگار بھی ہے، تفریح بھی ہے، عشق بھی ہے اور عبادت بھی ہے۔ ایسے لوگ اور کچھ نہیں کرتے، شاید کر بھی نہیں سکتے۔

ممبئی شہر سے صرف چار اردو روزنامے (تین صبح میں اور ایک دوپہر میں) نکلتے ہیں جن کی مجموعی اشاعت ایک لاکھ سے کافی کم ہے۔ اس شہر میں بسنے والے تیس لاکھ مسلمانوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے اردو اخبارات کی اتنی اشاعت اونٹ کے منہ میں زیرہ معلوم ہوتی ہے لیکن اردو والے اس تعداد کو ایک لاکھ تک پہنچنے دینا نہیں چاہتے۔ اس لیے وہ اخبار مانگ کر یا نکڑ کے ریستوران میں بیٹھ کر باری باری پڑھتے ہیں، خریدنا ہو تو انگریزی اخبار خریدتے ہیں، اس لیے کہ اس کی ردّی سے معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔

ہندوستانی سرکار نے دنیا کے چھ شہروں، برلن، لندن، لاس اینجلز، سینٹ پیٹرس برگ، اسٹیٹ گارٹ اور یوکوہاما کو ممبئی کی بہنیں قرار دیا ہے۔ ان بہنوں کا انتخاب کرتے وقت سرکار کا پیمانہ حسن تھا، ذہانت تھی یا دولت...... یا مقابلہ حسن کا سب سے بڑا پیمانہ اسپورٹس مین اسپرٹ...... یہ ہم نہیں جانتے اور جاننا بھی نہیں چاہتے۔ اس لیے کہ ہم بھی آپ کی طرح آج تک پورا ممبئی شہر ٹھیک سے نہیں دیکھ پائے تو اس کی بہنوں کی تمنا کیا کریں۔

○○

ماہر تعلیم

ایک زمانہ تھا جب تعلیم یافتہ لوگ کافی پڑھے لکھے ہوا کرتے تھے۔ آج کی طرح نہیں کہ چار کتابیں پڑھ لیں اور بی۔اے کہلائے، دو کتابیں اور پڑھ لیں تو ایم۔اے ہو گئے۔ پھر ایک کتاب کی ایڈیٹنگ کر لی تو یونیورسٹی نے زبردستی پی۔ایچ۔ڈی کی سند دے دی اور ڈاکٹر ہونے کی تہمت لگا دی۔ لیکن پُرانے زمانے میں تعلیمی صورت حال اتنی خوش گوار نہیں تھی اور ہر سال یونیورسٹیوں سے ایسی ہستیاں برآمد ہو جاتی تھیں جو آگے چل کر ملک و قوم کا نام روشن کرنے میں مصروف رہتی تھیں۔ اُس زمانے میں ایک اور خرابی یہ تھی کہ ماہرین تعلیم کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ یہ ماہرین تعلیم اتنے سادہ لوح ہوتے تھے کہ اپنے تدریسی فرائض کو ایمانداری سے انجام دینے کی دُھن میں غیر تدریسی آمدنی سے بھی محروم رہتے تھے۔ تعلیم کے مسائل پر گہری نظر رکھنے کے سبب ان کی آنکھیں کمزور ہو جایا کرتی تھیں۔ نوجوان نسل کی نفسیات سے پوری واقفیت حاصل کرنے کے عمل میں وہ خود بوڑھے ہو جاتے تھے۔ وہ عالمی سطح پر تعلیمی میدان میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگہی بھی رکھتے تھے مگر خود اپنے گھر میں فاقہ مستی کے مزے لوٹتے تھے۔ وہ شعر و ادب میں بھی اپنا وقت ضائع کرتے تھے اور اپنے کثیر مطالعہ کے سبب اپنی ذات میں خود ایک اسکول ہوا کرتے تھے جہاں سے وہ علم کے پیاسوں کو مفت سیراب کرتے تھے۔ جبکہ آج کے قابل ماہرین تعلیم اپنی ذات میں خود ایک کوچنگ کلاس ہوتے ہیں جہاں تک پہنچنے کے لیے ہر طالب علم کے منہ میں چاندی کا چمچہ ہونا لازمی ہوتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارا نظام تعلیم جیسے جیسے داخلوں کے بھاری ڈونیشن اور طلبہ کے وزنی بستوں سے جھکتا جا رہا ہے، ماہرین تعلیم کی تعداد بھی اسی رفتار سے بڑھتی جا رہی ہے۔

پچھلے دنوں اپنے شہر کے ایک سیون اسٹار ہوٹل میں اپنے ایک جدید ماہر تعلیم کے سات سالہ بچے کی سالگرہ کی تقریب میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے ساتھ ہمارے چھوٹے صاحبزادے بھی تھے جو دسویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ بیگم ہمارے ساتھ یوں نہیں آئی تھیں کہ انہیں کسی سہیلی کے گھر کٹی پارٹی میں جانا تھا۔ ہم نے اپنے دوست سے اپنے صاحبزادے کا یوں تعارف کرایا...... ''یہ ہمارے فرزند ہیں۔ ماشاءاللہ بہت ہونہار اور ذہین ہیں۔ تہذیب و اخلاق اور شائستگی کے پیکر ہیں۔ اسکول میں پڑھائی کے علاوہ کرکٹ، فٹ بال، ڈرامہ اور مباحثہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔''

ہمارے دوست نے زوردار قہقہہ لگایا...... ''ارے بھائی صاحب، یہ تہذیب، اخلاق، شائستگی سب پرانی چیزیں ہیں، اب ان کا چلن نہیں رہا۔ اصل چیز یہ ہے کہ آپ کا بچہ امتحان میں کتنے مارکس لاتا ہے۔ دیکھئے ہمارا بیٹا پچانوے فیصد سے کم نمبر کبھی نہیں لاتا۔ وہ شام کو کوچنگ کلاس جاتا ہے جہاں کی فیس چالیس ہزار روپے ہے۔ وہ کھیل کود اور ناٹک میں وقت برباد نہیں کرتا۔ ہاں، دیر رات تک سائبر کیفے میں بیٹھا چیٹ (Chat) کرتا رہتا ہے۔ یہ کمپیوٹر کا زمانہ ہے نا۔''

ہم نے شرم کے مارے سر جھکا لیا۔ ہمارا بیٹا ان کے صاحبزادے کے پاؤں کی دھول بھی نہیں تھا۔ ہمارے دوست ہماری کیفیت بھانپ گئے، کہنے لگے۔ ''چھوڑیئے بھی ان باتوں کو، آیئے آپ کو بڑے لوگوں سے ملاؤں۔ ان سے ملئے، یہ ہمارے خاص متر شرما جی ہیں۔ یہ کالج ایجوکیشن کے ایکسپرٹ ہیں۔''

ہم نے شرما جی سے ہاتھ ملایا۔ ان کی ہر انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ ہم نے ان سے پوچھا۔ ''آپ کا تعلق کس کالج سے ہے؟'' کہنے لگے۔ ''ممبئی کا ہر کالج اپنا ہے۔ آپ کے بچے کا ریزلٹ کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو، میں اسے کسی بھی کالج میں ایڈمیشن دلا سکتا ہوں، کبھی خدمت کا موقع دیجئے گا۔''

آگے بڑھے تو ایک اور ماہر تعلیم سے تعارف ہوا۔ ''یہ مسٹر مائیکل ہیں۔ بڑے مشہور سوشل ورکر ہیں اور ممبئی کے تمام اسکولوں کے ماہر تعلیم ہیں۔'' ہم سمجھ گئے کہ وہ کیا خدمات انجام دیتے ہیں، اس لیے خاموش ہی رہے۔ اس کے بعد ہمارے دوست نے ایک بہت بڑی توند والے سیاہ فام پہلوان نما شخص سے ہمیں ملایا۔ ''یہ کلّن بھائی ہیں۔ ممبئی کے سب سے بڑے ماہر تعلیم ہیں۔'' ہم نے ان سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ مناسب قیمت پر پی۔ ایچ۔ ڈی کرانے کا کام کرتے ہوں گے یا انجینئرنگ، میڈیکل یا کمپیوٹر ایجوکیشن کے ایکسپرٹ ہوں گے؟''

کلّن بھائی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ انہوں نے اتنے بھاری بھرکم الفاظ زندگی میں پہلی بار سنے تھے۔ ہمارے دوست نے ان کی جان بچائی، کہنے لگے۔ ''نہیں بھئی، کلّن بھائی یہ سب کام نہیں کرتے ہیں۔ ان کا تو اسپیئر پارٹس کا دھندا ہے۔ ایجوکیشن ان کا پارٹ ٹائم بزنس ہے اور یہ پی۔ ایچ۔ ڈی جیسا چھوٹا کام بھی نہیں کرتے۔ اس کا بھاؤ تو بہت کم ہے، اور میڈیکل اور انجینئرنگ کے لیے کسی ماہر تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں سب ریٹ فکسڈ ہوتا ہے۔ ہمارے کلّن بھائی کا کام تو سب سے زیادہ مشکل ہے۔ یہ نرسری اور کے۔ جی داخلے کے ایکسپرٹ ہیں۔ آج کل جو آدمی یہ کام کرا سکتا ہے، وہی سب سے بڑا ماہر تعلیم ہے۔''

یہ سن کر ہم نے چاہا کہ ہنس دیں، ہمارا منہ کھلا بھی ضرور، مگر اس میں سے ایسی آواز نکلی جیسے میونسپلٹی کے نل سے پانی آنے سے پہلے آواز نکلتی ہے۔ ہماری حالت غیر دیکھ کر ہمارے دوست نے قریب آ کر ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگے۔ ''گلوبلائزیشن کے اس دور میں ایکسٹرا آمدنی ہونا بے حد ضروری ہے۔ تم چاہو تو تم بھی ماہر تعلیم بن سکتے ہو۔''

ہم لاجواب ہو کر بیٹھ گئے۔ ہمارے صاحبزادے نے ہم سے پوچھا۔ ''ڈیڈی، یہ گلوبلائزیشن کا کیا مطلب ہوتا ہے۔''

ہم نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ٹھیک مطلب تو مجھے بھی معلوم نہیں ہے لیکن اتنا جانتا

ہوں کہ گلوبلائزیشن کے سمندر میں ہم بہت گہرے اُتر چکے ہیں اور اس نے ساری دنیا کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اب صرف دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کچھ نہ کچھ بیچ رہے ہیں اور دوسرے وہ جو کچھ نہ کچھ خرید رہے ہیں۔ اس لیے تعلیم بھی اب ایک چیز، ایک شئے بن کر رہ گئی ہے جسے جو چاہے خرید سکتا ہے اور بیچ سکتا ہے۔''

''مگر ڈیڈی، آپ تو کہتے تھے کہ تعلیم آدمی کو انسان بنا دیتی ہے؟'' ہمارے صاحبزادے نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ہم نے جواب دیا۔

''ہاں، سچ ہے مگر گلوبلائزیشن نے ہمارے چاروں طرف نت نئی چیزوں اور انوکھی اشیا کا ایک جنگل کھڑا کر دیا ہے۔ ہم سب ان اشیاء کے پیچھے بھاگتے بھاگتے خود بھی ایک شئے ہو کر رہ گئے ہیں، اور بیٹا، اشیاء کے اس جنگل میں انسان کہیں کھو گیا ہے۔''

جگمگاتے ہوئے وسیع و عریض ہفت ستارہ ہوٹل سے بے رونق چہرے لیے اپنے چھوٹے سے فلیٹ پر پہنچے تو وہاں گلوبلائزیشن ہم سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ بیگم کٹی پارٹی سے لوٹ چکی تھیں اور ان کا پھول ایسا منہ مزید پھولا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی پھٹ پڑیں۔

''میں آپ سے کتنے زمانے سے کہہ رہی ہوں کہ دفتری کام کے علاوہ بھی کچھ کیا کیجیے جس سے شہرت اور دولت حاصل ہو۔ یہ خالی خولی عزت سے کب تک کام چلے گا؟ اب یہی دیکھیے، میری ہر سہیلی کا شوہر پارٹ ٹائم سیاسی لیڈر ہے یا ماہر تعلیم۔''

''لیکن بیگم، سیاست کے لیے غنڈہ گردی کے جوگر سیکھنے پڑتے ہیں، ہم اس سے نابلد ہیں اور اسکول، کالج کے داخلے کرانا ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔ اس لیے ہم ماہر تعلیم بھی نہیں بن سکتے۔'' ہم نے اپنا دفاع کیا۔

بیگم کہاں ماننے والی تھیں۔ کہنے لگیں۔ ''آپ طنز و مزاح لکھنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اسکول کی درسی کتابوں کے اسباق نقل کر کے اخبارات میں اپنے نام سے شائع کرائیں۔ تب بھی آپ ماہر تعلیم بن سکتے ہیں۔''

ہم نے عرض کی۔ ''آج اردو اخبارات بڑے بوڑھے بھی نہیں پڑھتے تو اسکول کے طالب علم کیا پڑھیں گے۔ وہ تو اپنا سبق درسی کتاب میں بھی نہیں پڑھتے۔ اس کے

لیے کوچنگ کلاسیز اور پرائیویٹ ٹیوشنز کافی ہوتے ہیں۔''

بیگم نے پھر کوشش کی اور فرمایا۔ ''پھر آپ کسی سوشل ادارے کی بنیاد ڈالیے اور اس کے تاحیات صدر بن جایئے۔ مسز حسین کے شوہر نے یہی کیا اور اپنے ادارے سے غریب طلبہ کے لیے مفت کلاسیس جاری کر دیں۔ اب انہیں اسمگلروں اور مخبروں سے عطیات مل جاتے ہیں اور وہ خود ماہر تعلیم بھی مانے جاتے ہیں۔''

ہم نے مایوسی سے سر ہلایا اور جواب دیا۔ ''کسی سوشل ادارے کو قائم کرنا تو بہت آسان ہے۔ یوں بھی ہماری قوم میں مسائل اتنے زیادہ نہیں ہیں جتنی فلاحی انجمنیں ان مسائل کو حل کرنے کے لیے موجود ہیں۔ لیکن یہ اسکول کالج کے طلبہ کے لیے مفت کلاسیس چلانا ہمارے لیے ممکن نہیں...... کہ پڑتی ہے اس میں محنت زیادہ۔''

وہ پھر بھی نہیں مانیں اور میز پر مکا مارتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''پھر آپ آئی۔ اے۔ ایس، آئی۔ پی۔ ایس اور آئی۔ ایف۔ ایس کے اُمیدواروں کے لیے تربیتی کلاسیس چلایئے۔''

ہم حیرت زدہ رہ گئے۔ ''بیگم، ہم ایسا معمولی شخص اعلیٰ تعلیم کی کلاسیس کیسے چلا سکتا ہے؟'' وہ خفا ہو گئیں۔ ''مسز خان کے شوہر تو نان میٹرک ہیں۔ دن میں ٹیکسی چلاتے ہیں اور رات میں آئی۔ اے۔ ایس بننے کے خواہشمند طلباء کے لیے مفت کلاسیس چلاتے ہیں۔ آپ اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ جو لوگ ہر سال نوبل پرائز طے کرتے ہیں وہ خود نوبل انعام یافتہ تھوڑی ہوتے ہیں۔ بھارت رتن، پدم بھوشن، پدم شری دینے والے سیاستدانوں کے پاس تو کوئی خطاب یا ایوارڈ نہیں ہوتا ہے۔ پھر ماہر تعلیم بننے کے لیے تو آج ضروری ہے کہ آپ کم پڑھے لکھے ہوں۔ میرے خیال سے تو آپ اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔''

ہم ان تعریفی کلمات سے بد دل تو نہیں ہوئے پھر بھی ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ ''بیگم آپ کے پاس، یا آپ کی سہیلیوں کے پاس یا آپ کی سہیلیوں کے شوہروں کے پاس ماہر تعلیم بننے کا کوئی اور آسان نسخہ نہیں ہے؟''

"ہے، کیوں نہیں۔" انہوں نے چمک کر کہا اور اپنی زنبیل سے نسخہ کیمیا برآمد کرتے ہوئے فرمایا۔ "یہ دیکھئے، محکمہ تعلیمات والے ہر ریاست کے تمام ماہرین تعلیم کا رجسٹریشن کر رہے ہیں۔ اب بغیر رجسٹریشن کے ماہر تعلیم کی پریکٹس کرنا جرم قرار دیا جائے گا۔ آپ بھی صرف یہ فارم بھر کر رجسٹرڈ ماہر تعلیم بن سکتے ہیں۔"

ہمیں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہوا۔ فارم لے کر ہم نے اس کا بغور مطالعہ باآواز بلند شروع کیا۔ لکھا تھا......

۱۔ ماہر تعلیم کا نام ....

۲۔ ماہر تعلیم کے باپ کا نام ....

۳۔ کہیں ماہر تعلیم خود تعلیم یافتہ تو نہیں ہے..

۴۔ کتنے برسوں سے ماہر تعلیم ہیں..

۵۔ پہلی بار درخواست گذار کو کب محسوس ہوا کہ وہ ماہر تعلیم ہے؟..................

اتنا پڑھ کر ہم نے بے بس نظروں سے بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ زور سے ہنسیں اور کہنے لگیں۔ "یہ سب تو خانہ پُری کی باتیں ہیں، جو جی چاہے بھر دیجئے۔ کام کے سوالات تو اس کے بعد ہیں، وہ پڑھیے۔"

ہم نے آگے نظریں دوڑائیں تو لکھا تھا۔

۶۔ آپ تعلیم کے کس شعبے میں ماہر ہیں۔ (الف) ٹیوشنز اور کوچنگ کلاسیس، (ب) اسکولوں اور کالجوں میں داخلے، (ج) امتحانی پرچے آؤٹ کرنا، اسٹرائیک کرنا، (د) کالج اور یونیورسٹی میں ملازمت دلانا، وائس چانسلر بنانا، ہٹانا، (ہ) گرلز کالج کے باہر کی سرگرمیاں وغیرہ۔

۷۔ آپ ماہر تعلیم کا کاروبار گھر بیٹھے چلاتے ہیں یا کوئی دُکان ہے؟

اگر دُکان ہے تو اس کا رقبہ محلِ وقوع، دُکان سے شراب خانہ، دوا خانہ اور پولیس اسٹیشن کتنی دور ہے؟

یہ پڑھ کر ہمیں چکر آ گیا اور ہم نے کرسی کا سہارا لیا۔ بیگم نے ہمارے ہاتھ سے

فارم لے لیا اور کہنے لگیں۔ ''دیکھا کتنے آسان سوالات ہیں؟ ماہر تعلیم بننا اتنا آسان پہلے کبھی نہ تھا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

۸۔ کیا آپ کو دستخط کرنا آتا ہے؟

اگر ہاں تو بتائیے کیا آپ کو کبھی ریاستی اردو اکادمی کا ممبر بنایا گیا ہے؟

اگر نہیں آتا اور آپ سارے علمی کام انگوٹھے کے سہارے انجام دیتے ہیں تو براہ کرم لکھئے کہ کیا آپ کو کبھی ریاستی حج کمیٹی کا ممبر یا چیئر مین نامزد کیا گیا ہے؟

۹۔ کیا آپ اپنی تعلیمی لیاقت کی پروا کئے بغیر ہر برس ''بہترین اُستاد'' کے کم از کم پچاس ایوارڈ گمنام اساتذہ کے درمیان تقسیم کرنے کی اخلاقی جرأت رکھتے ہیں؟

اتنا سن کر ہمارا جی چاہا غش کھا کر وہیں گر جائیں۔ لیکن اس قدر آسانی سے ماہر تعلیم بننے کی اُمید نے ہمیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ ہم نے کمزور آواز میں پوچھا۔ ''بیگم، کوئی اور سوال بھی باقی ہے؟''

ہماری حالت دیکھ کر بیگم نے ہونٹوں پر ایسی فاتحانہ مسکراہٹ عود کر آئی جو اپنے شکار کے ساتھ تصویر کھنچواتے وقت شکاری کے ہونٹوں پر آتی ہے۔ کہنے لگیں۔ ''بس، ایک آخری سوال رہ گیا ہے۔ یہ لیجئے، آپ خود پڑھ لیجیے۔''

ہم نے دیکھا، جلی حرفوں میں لکھا تھا......

''کیا آپ جانتے ہیں ہمارے ملک کی ایک یونیورسٹی کے ایم۔اے اردو سال اول کے نصاب میں وہاں کے صرف چار پروفیسروں کے لکھے ہوئے مضامین ہی پڑھائے جاتے ہیں۔ اگر آپ کو بحیثیت ماہر تعلیم اس نصاب میں دخل اندازی کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو آپ مضمون نگار پروفیسروں کی تعداد کو مزید کتنا کم کریں گے؟

کیا آپ اس نصاب میں اپنے مضامین شامل کرنا پسند کریں گے؟''

یہ سوال پڑھ کر ہماری رگ وپے میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ کیا ہمارے مضامین بھی کبھی داخل نصاب ہوں گے اور وہ بھی ایم۔اے سال اول کے نصاب میں! اگر اختیار مل جائے تو ہم چاروں پروفیسروں کے مضامین منسوخ کر کے صرف اپنے مضامین

کا مجموعہ پڑھانے کا حکم دے دیں۔
لیکن کیا ایم۔اے سال اول کی جگہ سال دوم بہتر نہ ہوگا؟ خیر کیا فرق پڑتا ہے۔ سال دوم نہ سہی، سال اول ہی سہی۔ طلبہ کو معیاری ادب کا مطالعہ کرنے کی عادت سال اول ہی میں ڈال لینی چاہیے۔
آخری سوال کے بعد ایک ضروری نوٹ تھا۔ اس فارم کو پُر کرنے کے بعد مبلغ پچاس ہزار روپے کا ڈیمانڈ ڈرافٹ محکمہ تعلیمات، شعبہ ماہرین تعلیم کے نام بنوا کر فوراً روانہ کر دیں۔ ڈرافٹ ملتے ہی ماہر تعلیم کی سند روانہ کر دی جائے گی۔ سند موصول ہونے کے بعد درخواست گزار اپنے نام کے بعد یا نام سے پہلے جلی حروف میں "ماہر تعلیم (رجسٹرڈ)" لکھ سکیں گے۔
ہم گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پچاس ہزار کی رقم کہاں سے آئے گی؟ کہیں یہ گھاٹے کا سودا تو نہیں؟
"آپ رقم کی بالکل فکر نہ کریں۔" بیگم کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ "ہم بینک سے قرض لے لیں گے۔ آج کل بینک والے نوٹوں سے بھرے تھیلے لیے گھوم رہے ہیں۔ قرض لے لو، قرض لے لو۔ مگر کوئی اُنہیں پوچھتا نہیں۔ ایک مرتبہ ماہر تعلیم کی سند مل گئی تو ہم جلد ہی قرض چکا دیں گے۔"
ہمیں کچھ یاد نہیں، بیگم نے کب ہم سے فارم پر دستخط لیے، کب بینک سے قرض لے کر ڈرافٹ بنوایا اور کب فارم پُر کر کے بھیج دیا۔ اب ہم منتظر بیٹھے ہیں کہ کب حکومت ہمیں سند بھیجتی ہے اور کب ہم خریدنے والوں کے طبقے سے نکل کر بیچنے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں!

○○

ہیلو موبائل نمبر 786

''ابو! موبائل فون استعمال کرنے والوں کا چہرہ کیوں بگڑ جاتا ہے؟'' ہمارے چھوٹے صاحبزادے نے ایک دن ہم سے اچانک یہ سوال پوچھ لیا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں ہمارا ننھا سا موبائل فون اپنے قد سے بڑا معلوم ہو رہا تھا۔

ہمیں یہ سوال سن کر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ حیرت اس لیے کہ ہم نے اپنے گھر میں کئی آئینے لگا رکھے ہیں۔ چھوٹے، بڑے اور درمیانہ سائز کے بھی، تاکہ جب بھی ہمارا چہرہ بگڑنے لگے، ہمیں فوراً پتہ چل جائے۔ متوسط طبقے کے آدمی کو ان آئینوں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے ورنہ غریب آدمی کو اپنی دیواروں کے اُکھڑے ہوئے پلستر سے اور امیر آدمی کو ان ہی دیواروں کے اندر چھپائی ہوئی دولت سے اپنی حالت کا اندازہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ متوسط طبقے کے جن لوگوں کے گھر میں آئینہ نہیں ہوتا وہ اپنی بیوی کے چہرے پر اپنی بگڑتی ہوئی زندگی کی کہانی پڑھ لیتے ہیں۔ ہمیں اپنے بچے کے سوال کو سن کر افسوس یوں ہوا کہ ہم نے اتنے سارے بگڑے ہوئے بلکہ خوفناک چہروں کے ہاتھ میں موبائل دیکھنے کے باوجود موبائل کیوں خرید لیا۔ یہ سوال سن کر ہمیں موبائل سے اپنی محبت کے انجام پر رونا آ رہا تھا۔ مگر اس محبت کا آغاز بھی کہاں رومان انگیز تھا؟

دس برس پہلے کی بات ہے۔ موبائل فون نے ہمارے ملک میں نیا نیا قدم ہی رکھا تھا اور ابھی اسے سونیا گاندھی کی طرح ہندوستانی شہریت لینے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اس زمانے میں موبائل سیٹ کے دام ہماری ایک مہینے کی تنخواہ کے برابر تھے اور موبائل پر

گفتگو کرنا اتنا مہنگا تھا کہ ایک منٹ کی گفتگو کا اتنا بل بن جاتا تھا کہ اس سے دو غریب آدمیوں کو پیٹ بھر کھانا کھلایا جا سکتا تھا۔ اس طرح ہماری اگلے مہینے کی تنخواہ بھی اس کی نذر ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ ان دنوں ہم موبائل لے کر اترانے والوں پر حسرت بھری نظریں ڈالنے کے بعد اپنے چہرے کے تاثرات کو استہزائیہ مسکراہٹ سے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ یادش بخیر، اس زمانے میں ہم پاکستانی کرکٹ ٹیم کی فتح پر پٹاخے تو نہیں چھوڑتے تھے لیکن دوردرشن کے بور پروگراموں پر پاک ٹی۔وی کو ضرور ترجیح دیتے تھے، اور سچ پوچھیے تو آج بھی دیتے ہیں، اور اگر دوردرشن نے اپنا چال چلن نہیں بدلا تو آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔ ان ہی دنوں ہم نے پاکستان ٹی۔وی پر ایک ڈرامہ دیکھا تھا۔ اس میں ایک غریب کلرک اپنے والدین کے منع کرنے کے باوجود یا اسی کے سبب موبائل فون خرید لیتا ہے تاکہ دوستوں پر رعب ڈال سکے۔ مگر اس کے بعد گھر اور دفتر، دونوں ہی جگہ اسے موبائل فون کی وجہ سے مقبولیت کم اور رسوائی زیادہ ہاتھ لگتی ہے۔ پھر بھی وہ اسے سینے سے لگائے گھومتا ہے۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں کی طرح وہ پتلون کی کمر میں موبائل اس لیے نہیں لگا سکتا کہ شلوار قمیص ایجاد کرنے والوں کو موبائل کی آمد کا علم نہیں تھا۔ یوں بھی پاکستانی عوام پتلون پر شلوار کو ابھی تک اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ امریکہ نے ابھی تک شلوار قمیص پر پابندی عائد نہیں کی ہے۔ بہر حال ڈرامے کا انجام یہ تھا کہ جب موبائل کا پہلا دِل ہلا دینے والا بل آتا ہے تو ہیرو کے ہاتھوں کے طوطے نہیں اڑتے، اس لیے کہ وہ تو موبائل سیٹ کی خریداری کے وقت ہی اڑ چکے تھے، البتہ اس کے ہوش ضرور اُڑ جاتے ہیں اور وہ اپنے والد کی نصیحت اور ڈائرکٹر کی ہدایت کے مطابق موبائل کو لے کر گھر سے باہر نکلتا ہے جہاں ایک فقیر جھولی پھیلائے پہلے سے کھڑا ہے۔ یہ جھولی، آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ موبائل سے بھر دی جاتی ہے اور فقیر حیران پریشان کھڑا رہ جاتا ہے کہ اس نوازش پر وہ ہیرو کو دعائیں دے یا بددعائیں۔

اس کے بعد پاکستان ٹی۔وی کے پردے پر ایک امپورٹیڈ کار کا اشتہار دکھایا جانے لگا جسے خریدنے کی ترغیب ایک ایسی حسینہ دے رہی تھی جس نے ننھے منے بچوں

کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اس نے کئی دن سے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ چونکہ ہمیں امپورٹیڈ کار اور حسینہ، دونوں ہی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور ہم اپنی حسرتوں میں اضافہ بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ہم نے ٹی۔وی بند کر دیا اور سوچنے لگے کہ کاش ہم وہ فقیر ہوتے جس کی جھولی میں موبائل فون ڈال دیا گیا تھا۔ ہم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ موبائل فون فقیر کے حوالے کر دینے کے بعد ہیرو نے اس کا بل ادا کیا یا نہیں۔ ہم تو بس اس کے بعد کئی راتوں تک اپنے خوابوں میں فقیروں کا بھیس بدل کر اہل کرم کے تماشے کے منتظر رہے۔ مگر اسے دیکھنا ہمیں نصیب ہی نہیں ہوا۔

پھر یوں ہوا کہ اچانک شہر میں سینکڑوں، ہزاروں اچھے بھلے لوگ ایک ہاتھ کان پر رکھ کر دوسرا ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے، کھلے منہ کے ساتھ دکھائی دینے لگے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے سبھی کو قوالی گانے کا شوق چرانے لگا ہے۔ غور سے دیکھا تو وہ موبائل پر گفتگو کر رہے تھے ـــــ انتہائی اہم گفتگو ـــــ ہم حیران ہوئے کہ ان ہزاروں لوگوں کو موبائل کی کتنی سخت ضرورت رہی ہوگی اور جب تک موبائل کا ظہور نہیں ہوا تھا، ان لوگوں کی زندگی کتنے عذاب میں رہی ہوگی اور ان کی پچھلی نسلیں بھی بغیر موبائل کے اس جہانِ رنگ و بو سے کتنی اداس گزری ہوں گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی اپنی دو تہائی زندگی عیش و آرام کی چیزیں حاصل کرنے کا عذاب جھیلتا ہے اور بقیہ ایک تہائی زندگی ان چیزوں کے حاصل ہو جانے کے عذاب میں گزارتا ہے۔

لیکن سچ پوچھئے تو سب سے زیادہ عذاب سے ہم گزر رہے تھے اور ہمارے جیسے نہ جانے کتنے لوگ تھے جو ہماری طرح موبائل کا درد لیے گھوم رہے تھے۔ پہلے ہم یہ سوچتے تھے کہ تنخواہ میں اضافے کے بقایاجات ایک ساتھ ملیں گے تو بال بچوں کے لیے نئے کپڑے سلائیں گے، اپنے لیے لکھنے کی نئی سیکنڈ ہینڈ میز خریدیں گے، گھر کی دیواروں کو رنگ و روغن لگائیں گے اور باقی رقم مستقبل کے لیے بینک میں محفوظ کر دیں گے۔ مگر اب ہم پر ایک ہی دُھن سوار تھی، موبائل خریدیں گے۔ راستہ چلتے موبائل پر زور زور سے گفتگو کر کے دوسروں پر رعب ڈالیں گے۔ دفتر کے لیے گھر سے نکلیں گے تو کہہ کر

نکلیں گے کہ تھوڑی دیر بعد ہمیں موبائل پر فون کرنا اور بس اسٹاپ پر یا بھری بس کے اندر ہمارے موبائل کی گھنٹی بجے تو اسے دیر تک بجنے دیں گے تاکہ آس پاس کے تمام مسافروں کو خبر ہو جائے کہ ہم بھی جیب میں موبائل اور منہ میں زبان رکھتے ہیں۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہم دیکھتے رہے کہ موبائل فون کی قیمتیں آہستہ آہستہ کم ہوتی رہیں مگر وہ ہماری پہنچ سے باہر ہی رہا۔ پہلے وہ صرف کار نشینوں کے پاس دکھائی دیتا تھا جس کی وجہ سے وہ ایک ہاتھ سے کار ڈرائیو کرتے تھے اور ان کا دوسرا ہاتھ ضرورت پڑنے پر ان کی اپنی سکریٹری سے ہٹ کر موبائل سے کھیلنے لگتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ موٹر سائیکل اور اسکوٹر چلانے والوں کے پاس آ گیا۔ یہ وہ سواریاں ہیں جنہیں بہت سے نوجوان دونوں ہاتھ چھوڑ کر بھی چلا لیتے ہیں، ان کی یہ مہارت موبائل کے کام آنے لگی۔ اس کے بعد یہ ستم ہوا کہ جن لوگوں کے پاس پطرس کی سائیکل جیسی چیزیں تھیں، ان کی شناخت بھی موبائل کی وجہ سے قائم ہونے لگی۔ لیکن اس دن تو حد ہو گئی جب ہم ایک سیاسی افطار پارٹی میں پہنچے جہاں سیاستدانوں، اسمگلروں اور غنڈوں کے علاوہ صرف ہم تھے یا موبائل فون تھا جو ویٹروں کے علاوہ ہر شخص کے ہاتھ میں تھا۔ ہم جس میز پر بیٹھے تھے، وہاں ایک ہیبت ناک شکل کا امیر آدمی موبائل پر محو گفتگو تھا......

''ارے بھائی تو کدھر ہے۔ میں کب سے تیرے کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ ارے تو بھی اسی پارٹی میں ہے۔ ہاں مگر بھیڑ اتنی ہے کہ تو دِکھائی نہیں دیتا ہے۔ تو پھر میری ٹیبل پر ہی آجانا۔ میں دو نمبر گیٹ کے پاس دوسری ٹیبل پر بیٹھا ہوں۔ ہاں، ہاں، کھمبے کے نیچے......اپنی ٹیبل پر ایک آدمی بنا موبائل کے بیٹھا ہے......دور سے سمجھ میں آجائے گا۔''

ہم وہاں سے اُٹھ کر چلے آئے۔ کھلی معیشت اور کھلے بازار کا کمال یہی ہے کہ نت نئی اشیاء کا ایک ہرا بھرا جنگل اُگ آیا ہے۔ راستہ بھر ہم سوچتے رہے کہ موبائل جیسی گھٹیا چیز ہم کیوں خریدیں جو ہر غنڈے اور بدمعاش کے پاس موجود ہے۔ اچانک دیکھا تو ہمارے محلے کے ایک عالم و فاضل مولانا موبائل پر گفتگو کرتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ موصوف رمضان میں تراویح پڑھاتے تھے اور الیکشن کے دوران سیاسی جلسوں میں

تقریریں کرتے تھے۔ کبھی کبھی رمضان کے آس پاس الیکشن آجاتا تو بڑی مشکل میں پھنس جاتے تھے۔ وہ قریب آئے تو ان کی گفتگو سنائی دی......

''ہاں بھئی، پچھلے سال تو الحمد للہ دو عیدیں منائی گئیں۔ ایک بریلوی عید، ایک دیوبندی عید۔ امسال دیکھیے، اللہ مالک ہے۔ ہیلو، ہیلو، بھئی آواز نہیں آرہی ہے۔ یہ موبائل بھی کیا شیطانی آلہ ہے، ہاں ہیلو...... آپ سُن رہے ہیں نا!''

وہ بآواز بلند ہماری طرف ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے گزر گئے۔ اب موبائل سے ہماری نفرت کم ہوگئی تھی۔ بھئی، موبائل تو مولانا بھی رکھتے ہیں، پھر ہم کیوں نہیں رکھ سکتے۔ ممکن ہے افطار پارٹی میں بہت سے لوگوں نے نقلی موبائل لٹکا رکھا ہو۔ جب آدمی دوسروں کو ڈرانے کے لیے نقلی ریوالور رکھ سکتا ہے تو رعب ڈالنے کی خاطر نقلی موبائل کیوں نہیں رکھ سکتا؟ مگر مولانا کا موبائل تو اصلی ہی ہوگا۔ اس پر گفتگو جو کر رہے تھے۔ لیکن مولانا کو تو قاعدے سے افطار پارٹی میں ہونا چاہیے تھا، وہ یہاں کیا کر رہے تھے؟

گھر پہنچے تو زی۔ ٹی۔ وی سے خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ بہار کے وزیر اعلیٰ کو چارہ گھوٹالے میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ ہم سکتہ میں آگئے۔ کچھ عرصہ قبل تک موصوف جب بھی ٹی۔ وی پر دکھائی دیتے تھے، اپنے موبائل پر کسی نہ کسی سے نمائشی گفتگو کرتے نظر آتے تھے۔ دورانِ گفتگو ان کا چہرہ خوشی سے دمکتا رہتا تھا۔ بیچ بیچ میں اخباری نامہ نگاروں کو ہاتھ ہلا ہلا کر خاموش رہنے کا اشارہ بھی کرتے رہتے تھے۔ سچ پوچھیے تو موصوف کی وجہ سے موبائل کی شان بڑھ جاتی تھی اور موبائل کی بدولت موصوف کے چہرے کا بھولاپن کسی حد تک چھپ جاتا تھا۔ پھر نہ جانے کس بدخواہ کے مشورے پر انہوں نے ٹی۔ وی کیمرے کے سامنے موبائل کا استعمال ترک کر دیا۔ اسی کے ساتھ اُن کا زوال شروع ہو گیا۔ پہلے چارہ گھوٹالہ عام ہوا، پھر وہ وزیر اعلیٰ کی چارپائی سے اُتر کر جیل کی چہار دیواری میں مقید ہو گئے۔ کچھ بھی ہو جائے، ہم موبائل ضرور لیں گے۔ بڑے کام کی چیز ہے۔ آدمی بڑا نہ بھی ہو تو بڑا معلوم ہوتا ہے۔

چند ہفتوں بعد ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، شگفتہ مدیر شگوفہ، ممبئی تشریف لائے تو اُن کے

ہمراہ ایک ماہر اسلامیات بھی تھے۔ ہم نے شام کی چائے کے بعد اپنے مہمانوں سے اُن کے ارادے دریافت کیے تو وہ مچل گئے...... ”ہم تو فلم دیکھیں گے۔“

ہم نے کہا۔ ”آپ کے لیے ہم فلم میگزین منگا دیتے ہیں، اس سے دل بہلا لیجیے۔ اس میں بھی وہی سب...... بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔“

کہنے لگے۔ ”نہیں، ہم تو سنیما ہال میں فلم دیکھیں گے، وہ بھی بالکل نئی۔“

تھیئٹر پہنچے تو خدا کا شکر ہے فلم شروع ہو چکی تھی۔ سنیما کے پردے پر ہیرو اور ہیروئن اظہار عشق کے لیے ایک سو بیس گواہوں کی موجودگی میں بلکہ ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر ڈانس کر رہے تھے اور گیت گا رہے تھے۔ ہم یہ روح پرور منظر دیکھ ہی رہے تھے کہ موبائل کی گھنٹی بجی۔ ہم نے دیکھا اگلی سیٹ پر ایک خاتون نے موبائل پر جلدی جلدی بولنا شروع کیا۔

”ڈارلنگ، آج میں دیر سے گھر آؤں گی۔ تم کھانا پکا لینا، ہم ساتھ کھائیں گے۔“

ہمارے مہمانوں نے پہلے اس خاتون کو اور پھر ہمیں حیرت سے دیکھا۔ اس لیے کہ موصوفہ کے ایک ڈارلنگ تو ان کے ساتھ بھی یوں تشریف رکھتے تھے کہ ان کا ہاتھ موصوفہ کے کاندھے پر براجمان تھا اور موصوفہ کا سر اُن کے ڈارلنگ نمبر۲ کے کاندھے پر ٹکا تھا۔

ہم سوچنے لگے واقعی موبائل بڑی مفید شئے ہے۔ اگر لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال اور رومیو جولیٹ کے پاس بھی موبائل ہوتا تو ان کا انجام کتنا مختلف ہوتا۔ ذرا تصور کیجیے ـــــ سوہنی، مٹی کے گھڑے پر تیرتے ہوئے مہیوال سے اپنی کیفیت بیان کر رہی ہوتی اور ڈوبنے سے پیشتر مہیوال کو آخری موبائل سلام بھی کر سکتی تھی یا ممکن ہے کہ وہ تیرنے کا خطرہ مول ہی نہیں لیتی اور مہیوال کو موبائل پر فون کر کے اسے اپنے پاس آنے کا حکم صادر کر دیتی۔ اور فرہاد...... خیر جانے دیجیے۔ قصہ مختصر یہ کہ داستانیں کتنی دلچسپ اور ہیجان انگیز ہو جاتیں۔

فلم کے پردے پر ہیروئن کی شادی، ہیرو کے دوست سے طے ہو گئی ہے جس کے پاس موبائل بھی ہے۔ ہیرو جوئے خانے میں بیٹھا نقلی روپئے ہار رہا ہے اور غم

بھلانے کے لیے بغیر پانی یا سوڈا ملائے بوتل منہ سے لگائے شراب پی رہا ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ اگر کہیں مرزا غالبؔ کے پاس موبائل ہوتا تو وہ خرقہ اور سجادہ رہن رکھنے کی بجائے موبائل ہی رہن رکھ کر دعوتِ آب و ہوا کا اہتمام کر لیتے۔ اگر اُن کا موبائل رہن ہونے سے بچ جاتا تو وہ کوتوالِ شہر کے ہاتھوں گرفتار بھی نہ ہوتے، کیونکہ مولانا حالیؔ، شیفتہؔ یا اُن کی منظورِ نظر ڈومنی یا پھر خود مفتی صدرالدین آزردہؔ اپنے موبائل پر انہیں بتا دیتے کہ...... ''مرزا صاحب، ہوشیار، کوتوال آرہا ہے۔'' اور جب ہتھکڑیاں لیے ہوئے، مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا کوتوال جوئے خانے پر پہنچتا تو دیکھتا کہ مرزا صاحب اور ان کے دوسرے پنٹر (Punter) میلاد شریف میں مشغول ہیں۔ عود و عنبر کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا ہے اور مرزا صاحب جالی دار ٹوپی اوڑھے جھوم جھوم کر میلاد خوانی کر رہے ہیں۔ پھر یہ بھی ہوتا کہ مرزا صاحب خط کتابت یعنی مراسلے کو مکالمہ بنانے کی بجائے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو ہدایت کر دیتے...... ''کیوں خواہ مخواہ ڈاک کا بکھیڑا پالتے ہو۔ سیدھے سیدھے موبائل گھماؤ، غزل سناؤ، اصلاح لو اور چھٹی کرو۔ ہاں اس بات کا خیال ضرور رہے کہ موبائل کا بل تم ادا کرو۔ ورنہ اگلی بار تم چیخ چیخ کر مر جاؤ گے، تمہاری آواز مجھ تک نہیں پہنچے گی۔ ہرگز ہرگز نہیں پہنچے گی۔ بل کا طالب...... غالبؔ۔'' مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہم خطوطِ غالب کو آڈیو کیسٹ اور سی۔ ڈی کی شکل میں پاتے۔ البتہ مرتبین اور محققین کے اختلافات اور انکشافات سے محروم ہی رہ جاتے۔

لیکن میر تقی میرؔ اگر موبائل کے مالک ہوتے تو انہیں اس کے استعمال کی مہلت شاید ہی ملتی کیونکہ فکرِ سخن انہیں اس بات کا موقع ہی نہیں دیتی۔ ہاں کبھی کبھی وہ اپنے عطار سے ضرور رابطہ قائم کرتے، بیماریٔ دل کا حال بیان کرتے اور کہتے...... ''نسخہ اُسی کے ہاتھ سے بنوانا اور اُسی کے ہاتھ سے بھجوانا جس کے سبب میں اکثر بیمار رہا کرتا ہوں۔'' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرؔ صاحب اپنا موبائل اپنے کسی عقیدت مند نواب کے منہ پر دے مارتے اور کہتے...... ''تم کیا جانو سخن کیا ہوتا ہے اور سخن فہمی کسے کہتے ہیں؟ بس بیٹھے روپیہ گنا کرو۔'' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرؔ صاحب موسمِ بہار میں دامن اور گریباں چاک

کرنے کی بجائے جنون میں موبائل ہی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔

جوشؔ ملیح آبادی ہر آدھے گھنٹے بعد اپنی کسی محبوبہ سے بذریعہ موبائل رابطہ قائم کر کے اُسے اپنے ہوٹل کا پتہ اور کمرہ نمبر ضرور بتاتے یا پھر مجازؔ سے موبائل پر رابطہ قائم کر کے اُسے ہوش میں رہنے اور اپنے سامنے گھڑی رکھ کر شراب پینے کی تلقین کرتے۔ فراقؔ گورکھپوری سے آئی۔ایس۔ڈی پر لائن ملاتے اور کہتے...... ''خدارا مجھے ہندوستان بلالو۔مولویوں کی یہ نگری میرے لیے کوفہ بن چکی ہے۔'' حفیظؔ جالندھری کو موبائل کرتے اور کہتے...... ''میاں، پاکستان کا قومی ترانہ لکھ کر شہر بھر میں اِتراتے پھرتے ہو...... ارے شعر کہو شعر...... مگر تم کیا جانو کہ جگر کی آگ کیا ہوتی ہے۔''

ہم یہ سب سوچتے رہے اور فلم ختم ہو گئی۔ باہر نکلے تو ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کے دوست سگریٹ لینے کے لیے پان کی دُکان پر رُک گئے۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا تو پنواڑی موبائل فون پر کسی سے محوِ گفتگو تھا۔ آگے بڑھے تو دیوار پر اشتہار پینٹ کیے ہوئے تھے۔

''بابو بھائی پلمبر، نلوں کی مرمت کے لیے مشہور، رابطہ موبائل 9820021225، دوسرا اشتہار کسی حکیم صاحب کا تھا۔'' بڑھاپے کو پاس نہ آنے دیں۔ ساٹھ برسوں کا تجربہ رکھنے والے حکیم۔ مفت ہوم ڈیلیوری کے لیے موبائل نمبر 9821161596''۔ ہم نے دیکھا ہمارے دونوں دوست بھی ان اشتہارات کو غور سے پڑھ رہے تھے۔

اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ کیا ہم شہر کے آخری آدمی ہوں گے جو موبائل خریدے گا۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ اگلی صبح موبائل کمپنی کو فون کر کے ہم نے کہہ دیا کہ ہم بھی موبائل مالکوں کی بھیڑ میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس جو سب سے سستا موبائل سیٹ ہے، وہ ہمیں بھیج دیں۔ کمپنی کا سیلز ایگزیکٹو ہمارے دفتر پہنچا تو ہم نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔ ''آپ جلد از جلد کب ہماری موبائل لائن جاری کر سکتے ہیں؟''

وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا۔ ''اگر آپ چیک دیں گے تو تین دن بعد اور اگر نقد ادا کریں گے تو کل ہی، اور میں کوشش کروں گا کہ آپ کا موبائل نمبر 786 پر ختم ہو۔''

ہم نے جلدی سے کہا۔ ''ہمیں آپ کوئی بھی نمبر دیجیے، مگر لائن کل شروع ہو جانی

چاہیے۔"

وہ حیرت زدہ ہوکر بولا۔ "آپ پہلے مسلمان ہیں جسے 786 نمبر میں دلچسپی نہیں ہے۔ دہلی کی موبائل کمپنی نے 786 والے نمبروں کا نیلام کیا ہے اور وہاں کے مسلمانوں نے اسے پچاس ہزار روپے پریمیئم دے کر یہ نمبر خریدا ہے۔"

اب ہمارے حیرت زدہ ہونے کی باری تھی۔ مذہب کو تو ہم نہ جانے کب، کہاں چھوڑ آئے تھے اور صرف مسلک کے ہوکر رہ گئے تھے۔ یہ شاید گلوبلائزیشن کا کمال تھا کہ ہمارا عقیدہ مسلک سے بھی سکڑ کر محض نمبروں تک محدود ہوتا جارہا تھا اور وہ بھی نیلامی میں دستیاب تھا۔ ہمارا بس چلے تو ہم آئندہ اپنی دولت سے جنت میں بھی ریزرویشن کرانے کی کوشش کرنے لگیں گے۔

رات بھر ہمیں نیند نہیں آئی۔ صبح اُٹھ کر پہلے موبائل کو کان سے لگایا۔ ابھی ہماری نئی زندگی کی صبح طلوع نہیں ہوئی تھی۔ کمبخت نقد دام بھی لے گیا اور فون جاری بھی نہیں کیا۔ وقت گزاری کی خاطر ہم نے اخبار اُٹھایا تو ہر خبر پھیکی پھیکی لگی۔ آخری صفحے پر پہنچے تو ایک کالمی خبر تھی ...... "سنگاپور کے فقیر بھی موبائل استعمال کرنے لگے۔" خبر پڑھی تو معلوم ہوا کہ وہاں کے بھکاری اتنے خوشحال ہوگئے ہیں کہ اپنی پھٹی ہوئی جیب میں موبائل رکھتے ہیں۔ دوسری خبر اس سے بھی بُری تھی ...... "موبائل کے استعمال سے کینسر کا خطرہ۔" پتہ چلا موبائل کی ریڈیائی لہروں سے کینسر بھی ہوسکتا ہے۔ ہم نے گھبرا کر اخبار پھینک دیا اور فون کی طرف لپکے۔ ہم ابھی موبائل کا آرڈر منسوخ کرائے دیتے ہیں۔

اتنے میں ہمارے موبائل کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ دوسرے کمرے سے بیگم اور بچے دوڑے چلے آئے۔ ہم نے موبائل کان سے لگایا۔ دوسری طرف کوئی خاتون تھیں، بلکہ دوشیزہ رہی ہوگی۔ آواز آئی ...... "ہیلو موبائل نمبر 786، یو آر ویلکم ٹو اے۔ بی۔ ایل۔ موبائل فیملی۔ آپ کو اپنا نیا موبائل مبارک ہو۔"

○○
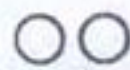
جنت کی حقیقت

ساری فلم انڈسٹری میں کہرام مچا ہوا ہے، فلموں کی شوٹنگ کئی ہفتوں سے بند ہے۔ بچوں کے والدین خوش ہیں کہ جن فلم والوں کے کارناموں کے سبب ان کے گھر میں دن رات قیامت برپا رہتی تھی، خدا نے ان پر اپنا عذاب نازل کر ہی دیا اور اگر فلمیں بنانا خدا کرے بند ہو گئیں تو اب ان کے بچے گھر کے اندر اور باہر نت نئے ناچ ناچنا اور چولی دامن کے رشتوں کے گیت گانا تو بند کر دیں گے۔ ادھر ہیرو پریشان ہیں کہ انہیں اب اگر نیا کام ملا بھی تو دھوتی کرتا پہن کر شوٹنگ میں حصہ لینا پڑے گا۔ ہیروئنیں حیران ہیں کہ اب وہ جسم کی نمائش کے بغیر اداکاری کیسے کریں گی۔ اب انہیں دراز ٹانگوں کی نمائش تو درکنار، دراز نقلی زلفوں کو بھی کیمرے کے سامنے لانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ جن کی سچ مچ لمبی زلفیں ہیں، انہیں زلف ترشوانے کا حکم جاری ہو گیا ہے۔ پروڈیوسروں نے فلم کی حد تک نئی لڑکیوں سے منہ موڑ لیا ہے اور اب وہ ادھیڑ عمر کی ستی ساوتری نظر آنے والی پُرانی ہیروئنوں سے دوبارہ رجوع ہو رہے ہیں اور پُرانی ہیروئنیں، جو چھوٹے موٹے رول کی تلاش میں در در بھٹکتی پھرتی تھیں، اب انہوں نے غمزے دکھانے شروع کر دیئے ہیں۔ نئے میوزک ڈائرکٹرز کو پتہ لگ گیا ہے کہ اب ان کے RAP کی دُکان بند ہو جائے گی۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ مغربی دھنوں کو درآمد کرنے کا کاروبار بند کر دیں گے اور اب وہ ہر قسم کی ہندوستانی کلاسیکی چیزوں کا ایکسپورٹ شروع کر دیں گے تاکہ ہمارے ملک میں سوائے دھرم کے کوئی اچھی چیز نہ رہنے پائے۔ فلمی

کہانی کاروں نے البتہ ہار نہیں مانی ہے اور وہ امریکی فلموں اور ناولوں سے کہانیاں چرانے کا خیال ترک کر کے دیو مالائی دھارمک اور کلاسیکی کہانیوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں جس کے نتیجے میں ایسی کتابوں کی مانگ اور قیمت دونوں بڑھ گئی ہے۔

لیکن سب سے زیادہ پریشان اور دُکھی وہ پروڈیوسر ہیں جن کی فلمیں ریلیز کے قریب ہیں اور سنسر ہونے والی ہیں۔ پروڈیوسر جھن جھن والا پر کل ہی دل کا زبردست دورہ پڑا ہے اور وہ بمبئ کے سب سے مہنگے ''پرلوک اسپتال'' کے انٹینسیو کیئر یونٹ میں قید ہیں جس کے باہر اب ''کڑی دیکھ ریکھ والا کمرہ'' کا نیا بورڈ ہندی میں لگا دیا گیا ہے۔ یہ اسپتال عام طور پر عرب سیاحوں سے بھرا رہتا تھا مگر جب سے انہیں بمبئ میں بیروت کی جھلک نظر آنے لگی ہے، انہوں نے عیش وآرام کے نئے مقامات دریافت کر لیے ہیں اور یہ شہر اور یہ اسپتال قدرے سونا سونا ہو گیا ہے اور اب معمر عربی عمامے اور نوخیز برقعے خال خال ہی یہاں نظر آتے ہیں۔ لیکن نئی سنسر پالیسی کا اعلان ہوتے ہی اسپتال کے منتظمین کو اُمید بندھ چلی ہے کہ اب ان کا اسپتال فلم پروڈیوسروں سے بھرا رہے گا۔ پروڈیوسر جھن جھن والا کی آنکھ کئی گھنٹوں کی بیہوشی کے بعد کھلی اور انہوں نے پچاس سالہ نرس کو اپنے اوپر جھکے پایا تو فوراً سمجھ گئے کہ ماجرا کیا ہے۔ نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔ ''یہ کون شا عیش پتال ہے؟''

نرس نے انہیں مسکرا کر دیکھا۔ اپنی جیب سے گائیڈ بک نکالی اور اس کے پہلے صفحے پر نظر ڈال کر انتہائی ملائمت سے بولی۔ ''آدرنیہ مہودے! یہ پرلوک سپتال ہے۔ آپ کرپیا شانت رہیں اور وارتالاپ نہ کریں۔''

جھن جھن والا کا دل پھر ایک بار زور سے دھڑکا۔ انہوں نے سوچا، ''اس عورت کو اگلی فلم میں میں اپنی ہیروئن بنا سکتا ہوں۔ نیا سنسر بورڈ اس بھارتیہ ناری کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ نئے سنسر بورڈ کا خیال آتے ہی کل شام کے واقعات ایک ایک کر کے انہیں یاد آنے لگے۔

کل شام جھن جھن والا کی اٹھائیسویں فلم ''جنت کی حقیقت'' نئے سنسر بورڈ کے

سامنے پیش ہوئی تھی۔ پچھلی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے ڈسٹری بیوٹرس نے منہ مانگے دام دے کر اس کی نمائش کے حقوق پہلے ہی خرید لیے تھے۔ مقررہ وقت سے ذرا پہلے ہی نئے سنسر بورڈ کے سارے ممبران سفید لباس میں ملبوس آگئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی بڑی شخصیت کے کریا کرم میں شریک ہونے آئے ہیں۔ جھن جھن والا کے اسسٹنٹ نے انہیں ایک ایک فائل دی تھی جسے وہ اپنی گود میں رکھے اپنی اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلی صف میں لال بجھکڑ جی، مرلی بھائی، نریمان سیٹھ، پورس خان کے ساتھ تولارام براجمان تھے۔ ان کے پڑوس کی ایک کرسی کانتاجی کے لیے خالی تھی جو ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ اگلی قطار میں ملہار سنگھ اشوک شرما، ونے گپتا اور بہاری بابو کے ساتھ فلم کا ڈائرکٹر اختر سہما ہوا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بعد پروڈیوسر جھن جھن والا کی سیٹ تھی جس میں اس وقت کانٹے اُگ آئے تھے۔ جیسے ہی کانتاجی اپنے گرتے ہوئے آنچل کو سنبھالتی بجلیاں گراتی منی تھیٹر میں میں داخل ہوئیں، سارے سنسر بورڈ کا دھرم جیسے سنکٹ میں پڑ گیا۔ ہر شخص کے پرنام نمسکار اور گرم نگاہوں کا جواب وہ اپنی قاتل مسکراہٹ کے ساتھ دیتی ہوئی جب بیٹھ گئیں تو جھن جھن والا نے ڈائریکٹر اختر کو آنکھ کا اشارہ کیا جسے پاتے ہی وہ اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا اور گویا ہوا۔ ''یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ......''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ لال بجھکڑ جی غرائے۔ ''اختر بھائی! ہندوستان میں رہنا ہے تو شدھ ہندی بولنا سیکھیے۔'' پھر وہ کانتاجی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ ''کیوں جی، آپ کے کیا وچار ہیں؟''

کانتاجی نے کوئی جواب نہ دیا تو اختر بھائی نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔ ''شما چاہتا ہوں۔ یہ بڑی پرسنتا کی بات ہے کہ دھرم ادھیکاری پارٹی نے فلموں پر اپنا سنسر بورڈ بٹھا دیا ہے اور جسے سرکار نے بھی انومتی دے دی ہے۔ پارٹی نے فلم انڈسٹری کو یہ آدیش دیا ہے کہ وہ مہیلاؤں کو منورنجن کی گڑیا بنا کر پرستوت کرنا بند کر دیں اور انہیں کیول گرہ لکشمی کے رول میں ہی درشائیں۔ فلموں میں سیکس تتھا ہنسا کا پرچار بھی روک دیا جائے پرنتو میری آپ سے ایک درخواست ہے کہ......''

''درکھاست نہیں...... وِنتی۔'' مرلی بھائی نے پان کا بیڑہ منہ میں دباتے ہوئے لقمہ دیا۔

''ہاں جی، وہی ہے کہ ہماری یہ پہلی فلم ہے جو نیا سنسر بورڈ دیکھے گا اور یہ فلم دھرم ادھیکاری پارٹی کے آدیش کے ملنے سے پہلے ہی بنائی جا چکی ہے۔ اس لیے آپ تھوڑا نرمی سے کام لیں۔ سنسر بورڈ کو نرم بنانے کے لیے ہم نے ہر سدسیہ کی فائل کے اندر ایک لفافہ رکھ دیا ہے۔ کرپیا آپ سب اسے پہلے دیکھ لیں۔ دھنیہ واد۔''

لفافے کے اندر پانچ سو روپوں کی گڈی رکھی دیکھ کر ہر ممبر کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ تولا رام نے اچک کر لال بجھکو جی کی فائل میں جھانکا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ دونوں کو ملنے والی رقم یکساں ہے تو وہ اپنی سیاہ عینک ناک پر ٹھیک طرح سے جما کر بیٹھ گئے۔

ڈائرکٹر کے اشارے پر فلم شروع ہوئی۔ جیسے ہی فلم کا ٹائٹل ''جنت کی حقیقت'' اسکرین پر نظر آیا، نریمان سیٹھ چلّائے۔ ''کٹ، کٹ۔ یہ نہیں چلے گا۔ اسے بدل ڈالیے، اس کا نام ہوگا ''سورگ کی واستوِکتا۔'' سارے ممبروں کے ساتھ پروڈیوسر اور ڈائرکٹر نے بھی گردن ہلا دی۔

فلم کی کہانی ایک آدرش وادی جرنلسٹ کی تھی۔ ظاہر ہے فلم کا ہیرو چاہے وہ صحافی کے رول ہی میں کیوں نہ ہو، بدعنوان تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ہیرو ایک فرقہ پرست لیڈر کے خلاف مضامین لکھ کر اسے اپنا دشمن بنا چکا ہے۔ فلم کے پہلے ہی منظر میں اخبارات کی سرخیاں دکھائی گئیں جن میں لکھا تھا۔ ''شہر میں ہندو مسلم فساد بھڑک اُٹھا۔'' اُسے دیکھتے ہی اشوک شرما نے ''کٹ'' کی صدا لگائی اور کہنے لگے۔ ''ہندو مسلم فساد کہنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے، دنگا ہندوؤں نے شروع کیا۔ یہ اب نہیں چلے گا۔ آپ اسے ''مسلم ہندو دنگے'' کا نام دیجیے۔''

جب فرقہ پرست لیڈر کا چہرہ کلوزاَپ میں دِکھایا گیا تو پارٹی کے لیڈر تولا رام جی نے فائل پٹخ دی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، نریمان سیٹھ چراغ پا ہو کر چیخنے لگے۔

''بھئی اس ویلن کی شکل تو ہمارے متر تولا رام جی سے ملتی ہے۔ اسے کاٹ دیجیے اور اس کی جگہ کسی موٹے تازے، مونچھ والے آدمی کو رکھئے جو امریکن گاگلز پہنے ہوئے ہو۔''

اگلے منظر میں ہیرو کو ایک دکان سے مرغی لیتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ دکان دار سیاسی لیڈر کے اشارے پر ہیرو پر مرغی چرانے کا جھوٹا الزام لگا کر اسے پولس کے حوالے کر دیتا ہے۔ لال بجھکڑ نے مرغیوں پر اعتراض اُٹھایا۔ ''جھن جھن والا تم نے فلم کو مانساہاری بنا دیا ہے۔ ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا اسے شدھ ہونا چاہیے۔ یہ مرغی والا سین کاٹ دو۔ اسے دیکھ کر ہماری نئی پیڑھی بگڑ جائے گی۔ اس کی جگہ کوئی سبزی کی دکان دکھاؤ۔''

یہ سن کر مرلی بھائی، لال بجھکڑ جی کے کان میں پھُس پھسائے پرنتو کل تو آپ کاک ٹیل پارٹی میں چکن تندوری...... لال بجھکڑ جی نے مرلی بھائی کو اپنی سرخ سرخ آنکھیں دکھائیں تو وہ خاموش ہو گئے۔

ہر نئی فلم کی طرح اس فلم کی کہانی بھی پُرانی تھی آدرش وادی جرنلسٹ کی بیوی اپنے دو بیٹوں کے ساتھ اپنے شوہر سے ملنے جیل کی طرف جا رہی ہے۔ راستے میں بے انتہا ٹریفک اور لوگوں کا ہجوم ہے۔ سنسر بورڈ کے ممبروں نے سوچا، اب اس عورت کا ایک بیٹا بچھڑ جائے گا اور سچ مچ راستے میں اس کا ایک بیٹا کھو جاتا ہے، جسے بعد میں ایک مسلمان گود لے لیتا ہے۔ جیل پہنچنے پر پتہ چلتا ہے کہ فرقہ پرست لیڈر کے بھیجے ہوئے ایک اور مجرم نے جیل کے اندر جرنلسٹ کو قتل کر دیا ہے۔ سنسر بورڈ کے ممبران نے سوچا، شاید اب جرنلسٹ کا بیٹا بدلہ لینے کی قسم کھائے گا اور دوسرے ہی لمحے جرنلسٹ کا دوسرا بیٹا وہیں باپ کے قتل کا بدلہ لینے کی قسم کھالیتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں بیٹے بڑے ہو جاتے ہیں۔ مسلمان گھر میں پلنے والا لڑکا باپ کا ہم شکل نکلتا ہے تاکہ فلم کے آخر میں اسے پہچاننے میں کسی کو دقت نہ ہو۔ یہ لڑکا پولس افسر بن جاتا ہے مگر غلط تربیت کے سبب ایماندار رہ جاتا ہے اور پولس والوں کے طور طریق نہیں سیکھ پاتا ہے۔ اتنا دیکھ کر بھی بورڈ ممبران نے سوچا کہ کہیں ڈائرکٹر نے دوسرے بھائی کو بے ایمان اور ظالم شخص کا رول تو نہیں دے دیا ہے؟ ان کا خدشہ درست

ثابت ہوا اور اگلے منظر میں دوسرا بھائی ایک بدعنوان اور بے ایمان صنعت کار اور بلڈر کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔

یہ سین دیکھتے ہی سارے ممبر ایک ساتھ چلائے۔ ''کٹ، کٹ کٹ۔'' آخر ہماری فلموں میں کب تک اس ملک کی اکثریت کا مذاق اُڑایا جائے گا۔ پوری کہانی بدلنی پڑے گی۔ یہ فلم پاس نہیں ہو سکتی۔'' ملہار سنگھ نے مکا لہراتے ہوئے کہا...... ''ڈائرکٹر اختر بھائی گھاگ شخص تھا اور ٹریجڈی کو کامیڈی میں بدلنے کے فن سے خوب واقف تھا۔ اس نے فلمی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے فوراً کہا۔'' ایسا کرتے ہیں ہم پولس آفیسر کو کرپٹ، ظالم اور بے ایمان کر دیتے ہیں اور ادیوگ پتی کو غریبوں کا ہمدرد بنا دیتے ہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے!'' لال بجھکو نے فیصلہ سنا دیا۔ بمبئی کی پولس کتنی ایماندار ہے یہ دنگوں کے بعد سبھی جان گئے ہیں اور یہی وہ ادیوگ پتی اور بلڈرز ہیں جو ہمیں الیکشن لڑنے کے لیے دان دیتے ہیں۔ دھرم کو بچانے کے لیے روپیہ دیتے ہیں۔''

فلم اپنی رفتار سے چلتی رہی۔ نوجوان ہیرو باپ کے قاتلوں کا پیچھا کرتے ہوئے کلب جا پہنچا تا ہے جہاں کیبرے ڈانس ہو رہا ہے۔ کیبرے کی دھن پر تمام ممبروں کے ہاتھ پیر تھرکنے لگے۔ پھر نگاہیں بھی تھرکنے لگیں۔ دزدیدہ نگاہوں سے وہ لوگ یکے بعد دیگرے کانتاجی کی طرف بھی دیکھ لیتے تھے۔ جیسے ہی ڈانس ختم ہوا کانتاجی نے اونچی آواز سے کہا۔'' نان سینس یہ نہیں چلے گا۔ جھن جھن والا! تم اس کی جگہ پن گھٹ پہ گوپیوں کا ترتیہ کیوں نہیں فلماتے۔ اسے کاٹ دو۔'' جھن جھن والا نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

اگلا منظر ظاہر ہے ایک ریپ سین تھا جس میں غنڈے پولس والوں اور حکومت کے عہدے داروں کی موجودگی میں ایک گونگی عورت پر حملہ کر دیتے ہیں۔ جیسے ہی سین شروع ہوا، کانتاجی چلائیں۔'' بھئی اسے بند کرو۔ اس کی انومتی تو بالکل نہیں دی جا سکتی۔''

''یہ سین پہلے پوری طرح دیکھ تو لیں، پھر کوئی فیصلہ کریں۔'' ونئے گپتا پہلی مرتبہ بولے مگر ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ کانتاجی نے انہیں گھور کر دیکھا۔ انہیں یاد آیا کہ خود ونئے اس طرح کے معاملات میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ سین پورا ہوتے ہی بہاری بابو

کہنے لگے۔ ''ہاں بھئی، یہ سین تو پورا کاٹنا پڑے گا۔''

''معاف کیجئے کانتا جی۔'' پورس خان نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو یہ منظر دیکھ کر ایسا لگا جیسے یہ گونگی لڑکی بوسنیا کی علامت ہے۔''

''میں آپ سے سہمت بھی ہوں اور نہیں بھی ہوں۔'' مرلی بھائی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔ ''جب میں یہ درشیہ دیکھ رہا تھا تو مجھے کچھ اور یاد آرہا تھا۔ اختر بھائی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ درشیہ نہ کاٹا جائے تو اس سین کو بدل دو۔''

جھن جھن والا نے اس مرتبہ بھی ہاتھ جوڑ دیے مگر اب ان کا سر چکرا رہا تھا۔ گھبرا کر انھوں نے بلڈ پریشر کی دو گولیاں جیب سے نکال کر بغیر پانی کے نگل لیں۔

تھوڑی ہی دیر میں کلائمکس کے مناظر شروع ہو گئے۔ ہیرو پولس انسپکٹر اپنے مجرم بھائی کا پیچھا جیپ میں بیٹھ کر کر رہا ہے۔ اس کا دل بہلانے کے لیے ہیروئن اس کی بغل میں بیٹھی آئینے میں اپنا میک اپ ٹھیک کر رہی ہے۔ اس نے اپنا دوپٹہ ایک کندھے پر یوں رکھا ہوا جیسے الگنی پر کپڑا سوکھ رہا ہے۔ بہاری بابو فوراً بول پڑے۔ ''بھئی یہ سیکس کا غلط استعمال ہے۔ یہ سین کاٹ دیجیے۔''

''مگر سرکار!'' ڈائرکٹر اختر بھائی نے دفاع کیا۔ ''شکنتلا میں بھی اس طرح کے مناظر ہیں جس میں جسم کی نمائش کو بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ ٹیلی ویژن پر دکھائی گئی کہانیوں میں ہر لڑکی دوپٹے کی جگہ اپنی زلفیں آگے رکھے ڈائیلاگ بولتی دکھائی دیتی ہے۔''

اشوک شرما چلائے۔ ''دھارمک فلموں میں من نہیں بھٹکتا ہے۔ آپ کی فلم تو کسی کا بھی دھرم نشٹ کر سکتی ہے...... ہمارا ابھی، کٹ!''

اب ویلن بھائی نے اپنی موٹر کار کو میدان میں پارک کر دیا ہے اور وہاں پہلے سے منتظر ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گیا ہے۔ ہیرو اُسے کئی آوازیں دیتا ہے، پستول تان کر ''گنگا جمنا'' اور ''مدر انڈیا'' جیسی فلموں کے پُرانے ڈائیلاگ دہراتا ہے اور پھر اپنے بھائی پر فائر کر دیتا ہے۔ ویلن گولی کھا کر وہیں اوندھے منہ گر جاتا ہے اور فلم کے بقیہ تمام کردار اور پولس والے مختلف سمتوں سے نمودار ہو کر گروپ فوٹو کھنچواتے ہیں۔

لال بجھکڑ جی ہاتھ ملتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ’’جھن جھن والا سیٹھ اور اختر بھائی! یہ پورا کلائمکس بدلنا پڑے گا۔ ہیرو جیپ کی سواری نہیں کرے گا، وہ رتھ پر بیٹھے گا۔ ویلن ہیلی کاپٹر سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے اُڑن کھٹولا لے کر آیئے۔ ہیرو ویلن پر گولی نہیں چلائے گا۔ اگنی بان سے اسے گرائے گا۔ وہ نہ ملے تو تیر کمان لایئے، بھالے بلّم لایئے۔ مگر یہ نہیں چلے گا۔ ہمیں اپنی فلموں میں ہندوستانی سبھیتا کو بتانا ہے۔ سمجھے آپ؟‘‘

فلم ختم ہو چکی تھی۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر اپنے ہاتھ میں فلم کے ٹکڑے لیے نمودار ہوا اور کہنے لگا۔ ’’صاحب، بارہ ہزار فٹ کی فلم میں سے سنسر بورڈ نے ساڑھے گیارہ ہزار فٹ کاٹ دیئے۔ اب صرف یہ ٹکڑے بچے ہیں۔‘‘

جھن جھن والا کو ایسا محسوس ہوا جیسے سنسر بورڈ کے ہر ممبر نے اچانک اس پر بلّم برچھی اور تیر کمانوں سے حملہ کر دیا ہو۔ درد کی شدت سے وہ بے حال ہو اُٹھا۔

بمبئی کے پرلوک اسپتال کے اِن ٹینسیو کیئر یونٹ کی ادھیڑ عمر نرس نے جھن جھن والا کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ مانیٹر پر نظر ڈالی اور سوچنے لگی کہ اب کسی ڈاکٹر کو بلانا بیکار ہے۔‘‘

○○

کارِ جہاں دراز ہے

اچانک ایک روز ہمیں خیال آیا کہ ہمارا اسکوٹر اور اس پر لکھا ہوا ہمارا مضمون دونوں بہت چل چکے اور اب مزید چلنے کی گنجائش نہیں رہی۔ اس لیے ہم نے گھر میں اعلان کر دیا کہ کل صبح ہم کار خریدنے جائیں گے۔ حسب توقع بیگم نے ہر اچھے کام کی طرح اس میں بھی رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کا آغاز کیا۔

''آخر آپ کار کیوں خریدنا چاہتے ہیں؟ آپ تو کم خرچ بالانشین کی نصیحت مجھے بھی اکثر کرتے رہتے ہیں۔'' انہوں نے پہلا حملہ کیا۔ ہم پر سچ بولنے کا موڈ طاری تھا اس لیے عرض کیا۔ ''بیگم، بات دراصل یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ملک میں سوشلزم کو پہلی بیوی کی طرح ایک کنارے لگا دیا گیا ہے اور دائیں بازو کی پالیسی کو اپنا کر ہم ہر قیمت پر دنیا میں اپنا مقام بنانا چاہتے ہیں، بالکل اسی طرح ہم بھی سماج اور ادب میں ہر قیمت پر کچھ مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کار خریدنے کے بعد اس پر ایک معرکۃ الآراء مضمون لکھیں گے۔''

انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''کہیں آپ اپنی خوش حالی کی نمائش کے ذریعے اکادمی ایوارڈ تو حاصل کرنا نہیں چاہتے ہیں؟''

دس برس پہلے بیگم اتنی معصومانہ بات کہہ دیتی تھیں تو ان پر پیار آتا تھا۔ اس سے مزید دس برس پہلے وہ ہماری بات سننے کے بعد ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو جاتی تھیں تو اور بھی اچھا لگتا تھا۔ آج یہ سن کر ہمیں ان کی دانشمندی پر بڑا ترس آیا تھا۔ ہم نے کہا۔

"شاید آپ نہیں جانتیں کہ کوئی بھی بڑا ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے آج کل محض موٹر کار کی نمائش سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے تو ایک عدد کار کی قیمت کے برابر رقم خرچ کرنی پڑتی ہے، تب جا کر کہیں بڑے ادیب کا آئیڈنٹی ٹی کارڈ ہاتھ لگتا ہے۔ اور اب تو زمانہ اور آگے بڑھ گیا ہے۔ کتاب کے ساتھ آڈیو کیسٹ اور سی۔ ڈی بھی بنوانے پڑتے ہیں اور اگر نشانہ گیان پیٹھ ایوارڈ ہو تو اپنے ناکردہ گناہوں کی تشہیر انگریزی اخبارات میں بھی کرانی پڑتی ہے اور ایوارڈ کمیٹی کے ممبران سے کتاب پر مقدمہ اور فلیپ لکھانے کی مہم سر کرنی پڑتی ہے۔"

ہماری اس تقریرِ دل پذیر کو اَن سنی کرتے ہوئے بیگم نے اپنے ترکش میں سے ایک اور تیر نکالا۔ "لیکن آپ کار خریدنے کی بجائے فلیٹ خریدنے کی کیوں نہیں سوچتے۔ میری ممی ہمیشہ یہی کہتی ہیں کہ جب تک تم لوگ بڑا مکان نہیں لے لیتے، میں وہاں زیادہ دنوں کے لیے رہنے نہیں آؤں گی۔"

ہم نے دل میں سوچا، چھوٹے گھر کی یہی تو خوبی ہے کہ وہ صاحب خانہ کو مہمانوں کے جبر وتشدد سے بچائے رکھتا ہے۔ مگر ہم نے عافیت کی خاطر سیاستدانوں کی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ "بیگم، چاہتے تو ہم بھی یہی ہیں کہ اتنا بڑا مکان لے لیں کہ آپ کی ممی اپنی ممی کے ساتھ مستقل ہمارے ساتھ رہیں، لیکن وہ زمانے لد گئے جب بڑے گھروں میں بڑے لوگ رہا کرتے تھے۔ اب تو جتنا بڑا گھر ہوتا ہے، اس میں سے اتنے ہی چھوٹے لوگ برآمد ہوتے ہیں۔"

وہ کہاں ہار ماننے والی تھیں۔ فرمانے لگیں۔ "پھر بھی میں آپ کو کار خریدنے کا مشورہ نہیں دوں گی۔ آپ کی یہ پرانی عادت ہے کہ بڑی بڑی چیزیں گھر میں پہلے لے آتے ہیں، انہیں استعمال کرنے کا سلیقہ بعد میں سیکھتے ہیں۔ اسکوٹر خریدنے کے دوسرے دن آپ نے ایکسی ڈینٹ کر دیا۔ نئے ویڈیو پلیئر کا Pause والا بٹن بار بار استعمال کرکے آپ نے پہلے ہی دن خراب کر دیا تھا۔ نئی واشنگ مشین ......"

بیگم کی اس تقریر نے ہمارے چودہ طبق روشن کر دئے اور ہمیں اپنی غلطی کا

احساس ہوا۔ یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ آج کل محبت کی شادیاں کیوں اتنی کامیاب رہتی ہیں۔ چنانچہ ہم نے فوراً ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے ٹریننگ اسکول کا رُخ کیا۔ وہاں ایک منحنی سا شخص جو شاید اسکول کا منیجر تھا، کئی پہلوانوں کے نرغے میں گھرا بیٹھا تھا۔ اس نے ہمارا مدعا جانے بغیر ہم سے کہا۔ ''یہ ایک مہینے کا کورس ہے۔ آپ کون سی گاڑی پر ڈرائیونگ سیکھیں گے؟ ماروتی یا فی ایٹ؟ ماروتی پر سیکھنے کی فیس دو ہزار روپے اور فی ایٹ کی فیس پندرہ سو روپے۔ اس میں رشوت کی وہ رقم بھی شامل ہے جو آر۔ ٹی۔ او افسر کو اس وقت دینی پڑتی ہے جب وہ آپ کا امتحان لیتا ہے۔''

ہم نے عرض کیا۔ ''رشوت دینا تو ہمارے کلچر میں شامل ہے اور اب تو لوگ رشوت کا اندراج ڈائریوں میں بھی کرنے لگے ہیں۔ مگر ہماری یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ماروتی کار کی فیس پانچ سو روپے زائد کیوں ہے؟ جبکہ ہم نے سنا ہے کہ ماروتی کار کی ڈرائیونگ اتنی آسان ہے کہ آج کل نئے دولتمند والدین اپنے بچوں کو بارہویں سالگرہ کا تحفہ ماروتی کار کی شکل میں دیتے ہیں تاکہ انہیں گھر چھوڑ کر فرار ہونے میں دقت نہ پیش آئے۔''

منیجر نے بیزاری کے ساتھ جواب دیا۔ ''صاحب، کیا کریں آج کل اسی کا فیشن ہے۔ جو آتا ہے ماروتی کی ڈرائیونگ سیکھنا چاہتا ہے۔ پہلی تاریخ سے ہم فیس دو سو روپے اور بڑھا رہے ہیں۔''

ہم نے سوچا کہ یہ گلوبلائزیشن کا زمانہ ہے اور جلدی ترقی کرنے کے لیے ملک جب سب کچھ دوسروں کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہے اور کئی سیاستدان تو ترقی کے غیر ملکی معاہدوں پر دستخط کرنے کے حوالے سے جیل کی صعوبتیں بھی سہہ رہے ہیں، عدالتوں کے چکر کاٹ رہے ہیں تو کیا ہم صرف پانچ سو روپے زائد ادا نہیں کر سکتے؟

چار و ناچار ہم نے اپنی جیبیں خالی کر دیں۔ اس نے گھنٹی بجا کر کسی کو بلایا اور ہم سے کہا۔ ''جائیے، پہلا سبق آج ہی سے لے لیجیے۔ یہ اعظم خاں ہیں، آپ کے انسٹرکٹر، ان کے ساتھ چلے جائیے۔''

ہم نے سر اُٹھا کر دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ الہ دین کا ایسا جن جسے برسوں سے کھانا نصیب نہ ہوا ہو، ہمارے سامنے تھا۔ اتنے موٹے چہرے پر لمبی ناک اور ہونٹ اور دہانہ یوں باہر نکلے ہوئے جیسے بہت کچھ کہنا چاہتے ہوں لیکن کہہ نہ پا رہے ہوں یا کسی بچے کی پیشانی پر بوسہ دینا چاہتے ہوں لیکن بچے کے رونے سے خوفزدہ ہوں۔ بچوں کی سی نیکر بھی پہنے ہوئے تھے، ہاتھ میں ڈرل ماسٹر کا ڈنڈا بھی تھا۔ چہرے پر وہ بیچارگی بھی جو گناہوں سے تائب ہوتے وقت کسی ڈاکو یا اقتدار سے بے دخل کئے جانے والے سیاستدان کے چہرے پر نظر آتی ہے۔ اگر ان کے چہرے پر مسکراہٹ نہ ہوتی تو سرکاری گواہ کا بھی گمان ہو سکتا تھا۔ خلاف توقع انہوں نے انتہائی مہذب آواز میں سر جھکا کر کہا۔ ”آیئے سر!“ اور ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے سر جھکا کر ہو لیے۔

پطرس کی بائیسکل کی طبعی حالت سے مشابہ ماروتی کار کا دروازہ کھول کر اعظم صاحب نے بسم اللہ کی۔ ”میرے بارے میں مشہور ہے کہ میں پریکٹیکل سے زیادہ اہمیت تھیوری کو دیتا ہوں اور آج تو میں آپ کو صرف تھیوری بتاؤں گا۔ دیکھئے، یہ کلچ ہے، یہ بریک ہے، یہ ایکسی لیٹر اور یہ......“

ہم نے حسب عادت ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”دیکھئے جناب! ہمارے پاس غریبی کی یادگار ایک عدد اسکوٹر ہے اور یہ سب چیزیں اس میں بھی موجود ہیں۔“

کہنے لگے۔ ”مجھے پتہ ہے۔ میں صرف یہ بتا رہا تھا کہ اسکوٹر میں یہ چیزیں ہاتھ میں ہوتی ہیں، کار چلاتے وقت یہ تمام چیزیں پیروں کے نیچے آجاتی ہیں۔“

ہم سوچنے لگے...... ٹھیک ہی تو ہے۔ یہ سب ترقی کی نشانیاں ہیں۔ غریبی میں انسان جن چیزوں کو سر پر بٹھاتا ہے، آنکھوں سے لگاتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر رکھتا ہے، دولت آتے ہی انہیں پیروں تلے روندنے لگتا ہے۔ ”دیکھئے مسٹر!“ اعظم صاحب کی آواز آئی۔ ”ڈرائیونگ کا پہلا اصول ہے کہ آپ کار چلاتے وقت کسی اور چیز کے متعلق سوچنا بالکل چھوڑ دیں اور اپنی نگاہ منزل کی طرف جمائے رکھیں۔“

ہم نے پھر سوچا۔ کار نشین ہونے کے بعد دوسروں کے متعلق کون بیوقوف سوچتا

ہے۔ارجن کی طرح نگاہیں صرف اونچائی کی طرف مستقل جمی رہتی ہیں۔ہم نے استادمحترم سے دریافت کیا۔ ”جناب بارہ برس پہلے اسکوٹر چلانا سیکھتے وقت ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ کلچ دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک روسی اور دوسرا امریکی۔کیا اب بھی یہی صورت حال ہے؟“

استادمحترم نے ہماری طرف رحم بھری نگاہوں سے دیکھا اور فرمانے لگے۔ ”آپ اتنا بھی نہیں جانتے، اب ساری دنیا میں صرف ایک امریکی کلچ ہے۔یہی نہیں، اسٹیئرنگ بھی اس کا ہے جسے وہ جہاں چاہے موڑ دیتا ہے۔روس کا پروڈکشن ناکارہ ثابت کیا جاچکا ہے۔“

آدھے گھنٹے تک ہمیں وہ موٹر کار کے اعضائے رئیسہ کے متعلق معلومات فراہم کرتے رہے اور ہم خیالوں میں گم سر ہلاتے رہے۔ہمیں کار کے اجزائے ترکیبی میں نہیں، اس کی افادیت اور غلط استعمال میں دلچسپی تھی۔کرنسی نوٹ کے متعلق یہ کون سوچتا ہے کہ اس میں کون سا کاغذ اور کیسی روشنائی استعمال ہوئی ہے۔ہمیں تو اس سے غرض ہوتی ہے کہ ہمارا کون سا نوٹ ہمارے دوستوں کو کتنی اذیت اور ہمیں کتنا عیش کا سامان فراہم کرسکتا ہے۔

”سر! کل سے آپ صبح سات بجے عملی مشق کے لیے آئیں گے۔“ اعظم صاحب نے فرمایا۔ ”وقت کی پابندی کا خیال رکھیں۔آج یہ آپ کا پہلا سبق تھا۔“ ہم نے استاد محترم کا شکریہ ادا کیا تو سر کھجاتے ہوئے بولے۔ ”سر، یہ آپ کا پہلا سبق تھا۔“

ان کے اصرار اور انداز پر ہمیں یاد آیا کہ ہم نے اکثر ہوٹل کے بیروں کو اس طرح سر کھجاتے ہوئے دیکھا ہے۔ورلڈ بینک اور آئی۔ ایم۔ ایف کے سامنے بھی ہمارے سربراہان ملک اسی طرح سر کھجاتے ہوں گے۔ہم نے اپنی جیب سے بیس روپے کا نوٹ نکال کر انہیں گرودکشنا پیش کی تو ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ ”سر! کل صبح دس بجے آیئے۔دس پندرہ منٹ دیر ہوگئی تو میں انتظار کرلوں گا۔“ ہم نے استادمحترم کو عقیدتمندی سے دیکھا۔ان میں اور آج کے اساتذہ میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں تھا۔

دوسرے دن ہم نے بہت ڈرتے ڈرتے کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔خونخوار

چہرہ لیے اعظم صاحب ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہم نے اپنا چہرہ کار کے اندر لگے آئینہ میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہمیں وٹامن 'بی کامپلیکس' کی کتنی ضرورت ہے۔ پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ جن ڈرائیوروں کی مخلوق کو ہم آج تک اتنا حقیر سمجھتے آئے تھے، دراصل کتنے بہادر اور عظیم لوگ ہوتے ہیں۔

''انجن اسٹارٹ کیجئے۔''

''کلچ دبائیے۔''

''پہلا گیئر ڈالئے۔''

''آہستہ آہستہ کلچ پر سے پیر اُٹھایئے اور ایکسی لیٹر دبائیے۔''

یکے بعد دیگرے اتنے احکامات سن کر ایسا لگا ہم کار میں نہیں، گھر میں بیٹھے ہوں۔ ہماری کار نے سڑک پر دوڑنا شروع کر دیا۔ مغرب سے ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں اور سوشلزم پر سے ہمارا رہا سہا ایمان بھی جاتا رہا۔ سرمایہ داری کے اسرار و رموز ایک ایک کر کے ہم پر کھلنے لگے۔ یہ بھی سمجھ میں آنے لگا کہ لوگ یہاں سے امریکہ جاتے ہیں تو لوٹنے کا نام کیوں نہیں لیتے۔ سڑکوں پر پیدل چلنے والے یوں بھی ہم کو مضحکہ خیز نظر آتے تھے۔ مگر اب تو سائیکل اور اسکوٹر سواروں کو دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی کہ کیسی عجیب وغریب سواری استعمال کرتے ہیں اور غصہ بھی آ رہا تھا کہ ہم کارنشینوں کی سڑک پر یوں دندناتے پھر رہے ہیں۔

''گاڑی تیز کیجئے، چوتھا گیئر ڈالیے۔'' اعظم صاحب کی کرخت آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ ہم نے خوشی کے ساتھ دیکھا کہ ہماری پڑوسن مسز کھنہ بس اسٹاپ پر کھڑی بے چینی کے ساتھ بس کا انتظار کر رہی ہیں۔ ہمارا ہاتھ بے اختیار ہارن پر چلا گیا۔ مگر ہارن بجنے سے پہلے ہی بس اسٹاپ گزر چکا تھا۔

''سر، آپ اسکوٹر نہیں، کار چلا رہے ہیں۔''

اعظم صاحب نے تنبیہ کی۔ ''یوں بھی بس اسٹاپ کے قریب ہارن نہیں بجانا چاہئے۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ آپ کسی خاتون کو لفٹ دینا چاہتے ہیں۔''

ہمیں غصہ تو آیا مگر کیا کرتے۔ اسکول کے زمانے میں بھی ہماری چوری پکڑ لی جاتی تھی تو اسی طرح اپنے استاد پر انتہائی خاموشی سے خفا ہوتے تھے۔

"دیکھئے سامنے سے ٹرک آرہا ہے، بریک لگایئے۔" اعظم صاحب نے گھبرا کر حکم دیا۔ ہم نے مزید گھبرا کر بریک کی بجائے ایکسی لیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ کار ایک دم سے تیز ہوئی مگر اس سے پہلے کہ ایکسی ڈنٹ ہوتا، جانے کیسے گاڑی اچانک رک گئی۔ ہم نے استعجابیہ نظروں سے اعظم صاحب کی طرف دیکھا۔

"یہ ٹریننگ کار ہے۔" وہ خفگی کے ساتھ بولے۔ "اس میں ایک بریک انسٹرکٹر کے پیر کے نیچے بھی ہوتا ہے تا کہ آپ جیسا کوئی اسٹوڈنٹ تیز رفتاری دکھائے تو اس پر روک لگائی جاسکے۔ کار دوبارہ اسٹارٹ کیجئے۔" اور قدرت کا نظام بھی یہی ہے صاحب۔ زیادہ اونچا اُڑنے والے کے پر کبھی بوفورس فائل تو کبھی حوالے کی قینچی سے کتر دیئے جاتے ہیں۔

"گیئر بدلئے۔ اور پھر وہ سامان سے لدا ٹرک تھا۔ اپنے سے بڑی گاڑی، آدمی یا ملک کے سامنے خاکساری برتنے ہی میں عقلمندی ہے، ورنہ وہ ہمیں عراق بنا دیتے ہیں۔ دیکھئے، پیچھے سے ٹیکسی والا ہارن دے رہا ہے، اُسے آگے جانے دیجئے۔ کارپوریشن نے یہ سڑکیں صرف اس لئے بنائی ہیں کہ خالی ٹیکسیاں اور بسیں ٹہلتی رہیں اور بھری ہوئی بسیں اور ٹیکسیاں دوسروں کو اوورٹیک کرتی رہیں۔ یہ تو ان ٹیکسی ڈرائیوروں کی انسانیت ہے کہ وہ ان سڑکوں پر پرائیویٹ کاروں کے چلنے پر اعتراض نہیں کرتے۔"

ہم نے ڈرتے ڈرتے اعظم صاحب سے اپنی دانست میں ایک دانشمندانہ سوال کیا۔ "جب ہماری سڑکوں کا یہ حال ہے تو حکومت نت نئی غیر ملکی کمپنیوں کو اپنی کاریں یہاں بنانے کی اجازت کیوں دے رہی ہے۔ ان لاکھوں نئی گاڑیوں کے لیے سڑکیں کہاں ہیں؟"

استاد اعظم نے ایک مرتبہ پھر ہماری طرف ترحّم کے ساتھ دیکھا اور گویا ہوئے۔

"آپ اتنا بھی نہیں جانتے۔ حکومت دراصل نئی سڑکیں اور شاہراہیں ہی بنانا چاہتی ہے۔

اس لیے وہ امیروں کو پہلے امپورٹیڈ گاڑیوں کی لت میں مبتلا کر رہی ہے۔ جب وہ اس لت میں گرفتار ہو جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ اب آپ اپنے سرمایہ سے خود سڑکیں اور شاہراہیں بنائیے۔ یعنی ایک پنتھ دو کاج۔ اسے کہتے ہیں ملک کی گاڑی چلانا، سمجھے آپ؟''

ذرا آگے بڑھے تو ٹریفک رُکا ہوا تھا۔ دیکھا تو کارپوریشن کی دو بسیں شمالاً جنوباً رُکی ہوئی تھیں اور دونوں بسوں کے ڈرائیور بیچ سڑک پر بس روکے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کر رہے تھے جس کی وجہ سے دونوں طرف کا ٹریفک رک گیا تھا۔ ہم نے استاد کی طرف کنکھیوں سے دیکھا تو مسکرا دیئے اور کہنے لگے۔ ''ان کی ضروری بات ختم ہونے تک انتظار کیجیے۔ آپ انہیں ٹوک نہیں سکتے۔ آج ہمارے ملک کی باگ ڈور آٹو رکشا، ٹیکسی اور بس ڈرائیوروں کے ہاتھوں میں ہے۔ ان ہاتھوں کی تعظیم کیجیے۔''

ہم نے سیاستدانوں سے سیکھا ہے کہ صبر آزما لمحوں میں مسکرا کر دائیں بائیں دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ داہنی طرف ایک بہت بڑے بورڈ پر لکھا ہوا تھا۔ ''شراب پی کر گاڑی چلانا موت کو دعوت دینا ہے۔'' استاد کی نگاہ پڑی تو فرمایا۔ ''یہ ہدایت صرف چھوٹی گاڑیوں کے لیے ہے ورنہ ٹرک ڈرائیور جس رات بغیر شراب پیے گاڑی چلاتے ہیں، ایکسی ڈینٹ کر دیتے ہیں۔'' ہم نے دل میں سوچا ہماری جگہ آج مرزا غالب ہوتے تو یقیناً ماروتی کار کی ٹریننگ چھوڑ کر ٹرک ڈرائیونگ سیکھنی شروع کر دیتے۔''

ہم نے استاد اعظم سے تفریحاً پوچھا۔ ''جناب! آپ نے کبھی بڑی گاڑی یعنی ٹرک وغیرہ کی بھی ڈرائیونگ کی ہے؟'' وہ خفا سے ہو گئے اور کہنے لگے۔ ''بڑی گاڑی......؟ حضرت میں حکومت کے لیے بلڈوزر بھی چلاتا ہوں اور مالکوں کے اشارے پر غیر قانونی بستیوں اور متنازعہ عبادت گاہوں کو بھی گرا چکا ہوں۔''

ہم خاموش ہو گئے۔ اب ہماری کار ایک ایسی تنگ اور گندی گلی سے گزر رہی تھی جو اتنی پُرہجوم تھی کہ آدمی کا گزرنا مشکل تھا، چہ جائیکہ کار۔ ہماری پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک اُٹھے۔ ''دوسرا گیئر ڈالیے۔'' استاد کہہ رہے تھے۔ ''گاڑی چلانے کا شوق رکھنے والے ہر شخص کا ایک مرتبہ یہاں آنا لازمی ہے۔ آپ تو یہاں کی خوشبو ہی سے

پہچان گئے ہوں گے کہ یہ مسلمانوں کا محلّہ ہے...... ذرا بچ کے...... یوں بھی آج کل الیکشن کے سبب یہاں بہت گاڑیاں آنے لگی ہیں ورنہ عام دنوں میں یہاں صرف سائیکل رکشہ اور خوانچے والے ہی نظر آتے ہیں۔ احتیاط سے ڈرائیو کیجئے۔ جو اِن گلیوں سے کامیاب گزر گیا، اسے لائسنس ملتے دیر نہیں لگتی ہے۔''

پہلی مرتبہ کار ڈرائیونگ کے بعد ہمارے ذہن و دماغ میں اجالا ہی اجالا بھر گیا تھا۔ چہرہ بھی یقیناً خوشی سے تمتمار ہا ہوگا۔ موٹر کار سے طبیعت نے زیست کا جو مزا پایا تھا، اس سے دردِ بے دوا میں اضافہ ہو گیا تھا۔

گھر میں داخل ہوئے تو ہر شئے پُرانی پُرانی سی لگ رہی تھی۔ اس ویرانی سی ویرانی کو دیکھ کر ہمیں بے اختیار اس دشت کی یاد آ گئی جس میں ہم کار دوڑا کر آ رہے تھے۔

ایک ہفتہ کی مشق کے بعد تو ہماری حالت غیر ہو چکی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کب ٹریننگ مکمل ہو اور ہم اپنی کار خرید کر ایک نئی دنیا میں داخل ہو جائیں۔ ادھر بیگم نے شکایت شروع کر دی تھی کہ آپ بدلتے جا رہے ہیں۔ مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ بچوں سے بھی لاپرواہی برتنے لگے ہیں۔ پہلے نیند میں کبھی کبھی مجھ کو پکار لیتے تھے مگر اب تو سوتے میں ''پہلا گیئر، دوسرا گیئر'' اور نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتے رہتے ہیں۔ ہمیں یہ سن کر حیرت ہوئی کیونکہ کار میں تو چار گیئر ہوتے ہیں۔

جیسے جیسے ہماری آتش شوق بھڑکتی گئی، اندرون خانہ سرد جنگ تیز ہونے لگی۔ خدا خدا کر کے ٹریننگ مکمل ہوئی اور ہم نے آر۔ ٹی۔ او (R.T.O.) افسر کی موجودگی میں ڈرائیونگ کا امتحان دیا تو محسوس ہوا موصوف نے محض رشوت کو کسی حد تک حلال کرنے کی خاطر امتحان لیا تھا۔ انہوں نے اتنی عجلت میں ہمیں کامیاب قرار دے دیا گویا انہیں ڈر ہو کہ ہم کوئی بڑی غلطی نہ کر بیٹھیں اور انہیں ہمیں فیل کرنے کے جرم میں رقم لوٹانی پڑ جائے۔ ڈرائیونگ لائسنس جیب میں رکھ کر گھر پہنچے تو ہنگامہ کے آثار نظر آئے۔ بیگم نے چھوٹتے ہی کہہ دیا۔ ''بس بہت ہو چکی ڈرائیونگ، اپنے پڑوسیوں کی طرح شریفانہ زندگی گزاریئے اور کار خریدنے کا خیال چھوڑ دیجئے۔ میں کہے دیتی ہوں، اگر آپ نے کار

خریدی تو میں بچوں کو لے کر میکے چلی جاؤں گی۔''

ادھر ہمارا بلندی پر بنایا ہوا منظر بیگم کی دھمکی سے تحلیل ہو رہا تھا، اُدھر سوویت یونین میں گیارہ ریاستوں نے بغاوت کر دی تھی۔

○○

ممبئی دُوردَرشن کی حمایت میں

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب دوردرشن نے اردو میں خبریں نشر کرنے کا احسان اردو دانوں پر کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ ہم اپنے ایک شناسا سے ملنے ممبئ کے مضافات میں واقع ان کے گھر پہلی مرتبہ پہنچے۔ حسب دستور انہوں نے تمام افراد خانہ سے ہمارا تعارف کرانا شروع کیا۔

''یہ ہماری بیگم ہیں (ماشااللہ)! کھانا بہت اچھا بناتی ہیں۔ یہ ہمارا چھوٹا بیٹا ہے لیکن نالائق نہیں ہے۔ اپنے کالج میں ہمیشہ فرسٹ کلاس میں کامیاب ہوتا ہے۔ ہمارا بڑا بیٹا دوسرے کمرے میں ہے، وہ پیدائش سے ہی گونگا ہے۔''

ہم نے اظہار افسوس کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈے، اور ناکام ہوگئے۔ وہ کہنے لگے۔ ''اس سے ملتے وقت دو باتوں کا خیال رکھیے گا۔ پہلی یہ کہ اسے رحم بھری نگاہوں سے نہ دیکھیں، اسے بہت صدمہ پہنچتا ہے۔''

وہ سانس لینے کے لیے رکے تو ہم نے سوچا کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے برادرانِ قوم کو نہ صرف دوسروں کی ہمدردی کا طلبگار پایا ہے بلکہ انہیں ہمیشہ خود رحمی کے مشغلے میں بھی مبتلا دیکھا ہے۔

''دوسری بات یہ کہ ہمارے گونگے بیٹے سے اشاروں میں بات نہ کریں بلکہ عام آدمیوں کی طرح اور ذرا بلند آواز سے گفتگو کریں۔ وہ آپ کے ہونٹوں کی جنبش سے آپ کی بات بخوبی سمجھ جائے گا۔'' ہمارے دوست نے ہمیں سمجھایا۔ خیر اشاروں میں

گفتگو کرنا تو ہماری تہذیب کے خلاف اور چیخ چیخ کر بات کرنا ہماری سرشت میں داخل ہے۔ جب ہم کسی کے مکان پر جاتے ہیں تو نیچے سڑک سے ہی باآواز بلند پکارتے ہیں اور اس وقت تک پکارتے رہتے ہیں جب تک سارے محلے کو ہماری آمد کی خبر نہیں ہو جاتی۔ عورتیں سامنے کے مکان میں رہنے والوں سے ان کی خیریت اپنی کھڑکی سے ہی پوچھ پوچھ کر ماحول کی صوتی کثافت میں خوش گوار اضافہ کرتی رہتی ہیں۔ فلیٹ میں رہنے کے باوجود وہ دروازہ کھول کر وہیں سے سارے پڑوسیوں کو اپنے گھر میں آنے والے ہر نئے سامان کی خوبیاں بحسن وخوبی بیان کر دیتی ہیں۔

بہر حال ہمارا تعارف ہوا اور ہم نے اپنے دوست کی مدد سے ان کے گونگے بیٹے سے گفتگو شروع کی۔ اس نے ہم سے پوچھا۔ ''انکل آپ کیا کرتے ہیں؟'' ہم نے کہا۔ ''بیٹے ہم اخبار میں لکھتے ہیں۔'' اس نے حیرت سے ہماری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''انکل آپ کس زبان میں لکھتے ہیں؟'' ہم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اردو۔''

یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں سے رحم جھلکنے لگا اور وہ جلدی جلدی غوں غاں، غوں غاں کی آوازیں نکالنے لگا۔ ہم نے اپنے دوست سے دریافت کیا۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' ہمارے دوست ہمیں جواب دینے کی بجائے اپنے بیٹے سے کہنے لگے۔ ''نہیں بیٹے ایسا نہیں کہتے۔'' ہم نے اصرار کیا تو وہ ہم سے کہنے لگے۔ ''آپ بُرا نہ مانیں۔ ہمارا بیٹا کہہ رہا ہے کہ آپ کی حالت تو ہم گونگوں سے بھی بدتر ہے۔ ٹیلی ویژن پر گونگوں کے لیے تو خصوصی خبریں نشر ہوتی ہیں لیکن اردو والوں کو تو اس کے لائق بھی نہیں سمجھا گیا ہے۔''

خیر صاحب، خدا خدا کر کے ہوا کا رخ ذرا سا بدلا اور اردو سے نابلد نیوز ریڈر نے دوردرشن پر اردو خبریں پڑھ کر سنانا شروع کر دیا۔ خبریں پڑھنے کا انداز بھی اتنا دل نشین ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ کوئی ان کے سامنے بندوق تانے کھڑا ہے کہ نہیں پڑھو گے تو موت کے گھاٹ اُتار دیئے جاؤ گے یا ممبئی دوردرشن پر اردو ادبی پروگرام کے انچارج بنا دیئے جاؤ گے۔ اس کے برعکس پاکستان ٹیلی ویژن کی نیوز ریڈر کو ہر لمحہ یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ ان کے سر سے آنچل نہ گر جائے اور ان کی نوکری خطرے میں پڑ جائے۔

لیکن جہاں تک ٹیلی ویژن پروگراموں کا تعلق ہے، ہم ایسے اردو کے شیدائی اکثر پاکستان ٹیلی ویژن کو آزماتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ممبئی دوردرشن کا خیال ہے کہ ادبی ذوق کی تسکین کے لیے ایک مہینے میں آدھے گھنٹے کا پروگرام ہی کافی ہوتا ہے اور وہ بھی بھری دوپہر میں جب آدمی دفتر میں ہوتا ہے، کھانے کی میز پر ہوتا ہے یا حسرت موہانی کے معشوق کی طرح ننگے پاؤں مکان کی چھت پر کسی کو بلانے کی کوشش میں مصروف ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر قوالی، غزل، مشاعرہ یا ادبی مباحثہ کی کہکشاں دیکھنے اور سننے کو مل جائے تو پھر مہینہ بھر ٹی۔ وی دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی اور بجلی کی خاصی بچت ہو جاتی ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ پاکستان جیسا ملک جو گلے گلے تک، بلکہ اس سے بھی اوپر کہیں پیشانی تک بیرونی قرضوں اور اندرونی کرپشن میں ڈوبا ہوا ہے، اپنے اردو پروگراموں پر روپیہ پانی کی طرح بہا رہا ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اردو کے پروگرام دیکھیں اور حکومت کے خرچ پر محظوظ ہوں۔ جبکہ دوردرشن کا نصب العین یہ ہے کہ اردو والے عقل کے ناخن لیں اور ایک مرتبہ اردو پروگرام دیکھنے کے بعد دوسری بار دیکھنے کی تمنا نہ کریں۔ پاکستانی ٹیلی ویژن سے ایک پروگرام نشر ہوتا ہے جس کا نام "بنتِ حوا کے نام" ہے اور جس میں عورتوں کے مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے ملک کے نامور وکلاء، جج، سماجی کارکن، صحافی، دانشوروں اور ادیبوں کو بلایا جاتا ہے۔ سنا ہے جس وقت یہ پروگرام نشر ہوتا ہے پاکستان کی تمام خواتین باورچی خانے کو مقفل کر کے ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ جاتی ہیں۔ جہاں آزادیٔ نسواں کے مخالف ان کے بھائی، شوہر، یا والد پہلے سے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے پروگرام کے بنانے پر کثیر روپیہ خرچ ہو جاتا ہے، دوم یہ کہ پروگرام جتنی دیر نشر ہوتا ہے، عوام اپنا کام ترک کر دیتے ہیں اور ملک کی ترقی بھی رک جاتی ہے۔ چنانچہ دوردرشن ایسے غیر سماجی پروگرام کو اردو والوں سے دور رکھ کر اپنی اور دونوں کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

ایک اور دلچسپ ادبی پروگرام پاکستان ٹیلی ویژن پر مشہور ادیب مستنصر حسین تارڑ پیش کرتے ہیں جس میں وہ کسی ادبی موضوع پر سامعین کی موجودگی میں ملک کے

صف اول کے ادیبوں اور شاعروں سے گفتگو کرتے ہیں اور اپنے دلچسپ سوالوں سے شرکاء اور ناظرین دونوں کو باندھ کر رکھتے ہیں۔ جبکہ ممبئی دوردرشن ناظرین کو کھلا چھوڑ دینے کا قائل ہے۔ اس لیے وہ ایسے ادبی پروگرام پیش کرتا ہے جس کے دوران ہم اطمینان سے کھانا بھی تناول فرما سکتے ہیں، شیو بھی بنا سکتے ہیں اور ٹیلیفون پر غیرضروری گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوردرشن کا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ممبئی ایسے شہر میں صف اول کے مشہور و مقبول شاعر و ادیب اور دانشور موجود ہی نہیں ہیں۔ اور اگر ہیں تو ان کا پتہ اسے معلوم نہیں ہے اور اگر پتہ مل بھی جائے تو انہیں بُلانے میں کافی رقم ضائع ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے ہم ایسے گمنام اور غیرمعروف ادیبوں اور شاعروں کو پروگرام میں شریک کر کے اسے حتی المقدور غیر دلچسپ بنانے میں دن رات مصروف رہتا ہے۔

پاکستان ٹیلی ویژن والوں کی ناسمجھی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے اردو پروگرام میں انٹر کالج تقریری مقابلے اور بیت بازی کے مقابلے بھی منعقد کرتے ہیں اور یونیورسٹی میں ہونے والے موضوعاتی مباحثوں کو بھی شروع سے آخر تک بتاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور تعلیمی پروگرام میں یونیورسٹی کے ایک پروفیسر اردو کی کلاسیکی غزلوں کی انتہائی آسان زبان میں تشریح بھی بیان کرتے ہیں۔ ان پروگراموں کو ممکن ہے وہاں کے نوجوان طلبہ شوق سے دیکھتے ہوں اور قیاس ہے کہ کچھ فیض بھی اُٹھاتے ہوں لیکن ممبئی دوردرشن بخوبی جانتا ہے کہ اردو والوں کے لیے تعلیمی اور تدریسی پروگرام بالکل غیرضروری ہیں۔ ان کا کام تو غزل اور قوالی سے ہی چل جاتا ہے۔ ہمیں تو پاکستان ٹیلی ویژن والوں کی عقل پر کبھی کبھی ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے چینل پر باقاعدہ ایک سائنسی پروگرام بھی نشر کرنے کا اہتمام کرتے ہیں اور معاشیات جیسے خشک اور غیرمفید موضوع کو بھی دل نشین اور آسان زبان میں پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

اب آپ ہی بتائیے، گل و بلبل کی شاعری پر سر دھننے والے ارد ناظرین کا سائنس ٹیکنالوجی اور معاشیات سے کیا تعلق ہے اور ان پر عوام سے حاصل کیا ہوا روپیہ

کیوں ضائع کیا جائے۔ غالباً ان ہی پروگراموں کی وجہ سے آج پاکستان سائنسی اور معاشی دوڑ میں ہم سے اس قدر پیچھے ہے۔ مبارکباد کے مستحق ہیں ممبئ دوردرشن کے ارباب مجاز، جنھوں نے اردو پروگرام کو قوالی، غزل، مشاعرہ اور ادبی مباحثہ کے چار کھونٹوں سے اور اتنے ہی فنکاروں سے مضبوطی کے ساتھ باندھ رکھا ہے تاکہ دوسری زبانوں کے شائقین تک یہ پیغام پہنچ جائے کہ اردو والے ابھی تک انیسویں صدی ہی میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ ممبئ دوردرشن کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے کیمرے کو بھی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اور اس سے کہہ دیا ہے کہ رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ۔ یہی وجہ ہے کہ ممبئ دوردرشن کے اردو پروگرام اسٹوڈیو ہی میں فلم بند کیے جاتے ہیں اور کیمرہ باہر کی دنیا کا اجالا کبھی نہیں دیکھ پاتا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ پاکستان ٹیلی ویژن اپنے نااہل کارکنان کا ایک وفد ہندوستان بھیجے اور وہ ممبئ دوردرشن کے لائق افسران سے ملاقات کرکے ان سے تبادلۂ خیال کرے اور ان سے یہ سیکھے کہ کم سے کم خرچ میں اردو والوں کے لیے معیاری پروگرام کس طرح بنائے جاسکتے ہیں۔ کیا ممبئ دوردرشن اس پاکستانی وفد کی مہمان نوازی کے لیے تیار ہے؟ کیا ممبئ دوردرشن تک ہماری آواز پہنچ رہی ہے......!

○○

شترمرغ کی تلاش

جب اکبر الہ آبادی نے سوا سو برس پہلے یہ شعر کہا تھا......

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیوی کی نوج سے

......تو انہیں شاید یہ اندازہ نہیں رہا ہوگا کہ اکیسویں صدی کی نئی نسل کو لفظ ''نوج'' کے معنی بھی معلوم نہیں ہوں گے۔ آج اردو کے کسی استاد سے بھی ''نوج'' کے معنی پوچھ لیجئے تو شرما جاتے ہیں اور کبھی کبھی بغلیں بھی جھانکنے لگتے ہیں حالانکہ اگر وہ اپنی مادری زبان کے اس لفظ کے معنی اپنے والدین سے دریافت کر لیتے تو انہیں پتہ لگ جاتا کہ یوں تو اس لفظ کے لغوی معنی ''خدانخواستہ'' یا خدا نہ کرے کے ہیں لیکن پرانے زمانے کی عورتیں اسے کلمۂ پناہ کے طور پر نفرت یا غصہ کے عالم میں اتنی مرتبہ استعمال کرتی تھیں کہ بہادر سے بہادر شوہر بھی ان کے آگے شہید ہو جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ آج کل کی ماڈرن بیویوں کو غصہ آتا ہے تو وہ سیدھے چائے کی پیالی شوہر کے منہ پر دے مارتی ہیں۔ جو بیویاں عدم تشدد پر یقین رکھتی ہیں وہ نفرت، غصہ یا پیار کے اظہار کے وقت انگریزی کی وہ گالی بے دریغ استعمال کرتی ہیں جس میں ان کے شوہر کی ولدیت کو شک کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہو۔ لیکن چونکہ عام طور پر کمانے والی بیوی یہ گالی افشانی کر رہی ہوتی ہے، اس لیے شوہر نامدار اسے سن کر بالکل بے مزہ نہیں ہوتے۔ بس سابق وزیر اعظم کی طرح آنکھ بند کر کے مسکراتے رہتے ہیں۔

آپ نے وہ گھسا پٹا قول تو سنا ہوگا کہ دنیا میں ہر کامیاب مرد کے پیچھے عورت ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہ بات کسی زمانے میں سچ رہی ہو یا کسی فلاسفر نے اپنی جاہل بیوی کو خوش کرنے کے لیے یہ بات کہہ دی ہو، لیکن آج کے کامیاب مردوں کو دیکھئے۔ ان کے تعلقات اپنی بیویوں، سیکرٹریوں اور دوسروں کی بیویوں سے ملاحظہ فرمائیے یا پھر آج کے ٹی۔وی سیریئلز غور سے دیکھئے تو آپ بھی اس جدید قول و فعل پر ایمان لے آئیں گے کہ ''دنیا میں ہر کامیاب انسان کے پیچھے ایک عورت اور ہر ناکام شخص کے پیچھے ایک بیوی ہوتی ہے۔'' لیکن امریکہ کے سابق صدر بل کلنٹن کا معاملہ دوسروں سے جدا ہے۔ انہیں سپر پاور بنانے میں نہ جانے کتنی عورتوں کا ہاتھ تھا اور پھر جب ایک مخصوص خاتون نے انہیں غیر معمولی شہرت اور ناکامی کے غار میں دھکیلا تو وہاں ان کا استقبال ان کی اپنی بیوی نے بیلن کے ساتھ کیا اور ایسا محسوس ہوا کہ اکبر الہ آبادی نے یہ شعر بل کلنٹن کے لیے ہی لکھا تھا......

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیوی کی نوج سے

سچ پوچھئے تو آج کا کامیاب مرد بیوی کی نوج سے شہید ہونے کی اداکاری بھی کرنا چاہتا ہے اور کسی سلطان کی فوج سے نہیں بلکہ کسی سلطانہ کی عشوہ طرازیوں کی موج میں بہنا بھی چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ خود اندر سے دونوں کی حقیقت کو جانتا ہے۔ بقول شاعر......

ایک مس، ایک مسز دونوں کا حال اچھا ہے
مفت ہاتھ آئے جو اپنے وہی مال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے دونوں کی حقیقت لیکن
''دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے''

خود مرزا غالبؔ بھی شادی کو حکم حبس دوام اور بیوی کو پاؤں کی بیڑی، پھانسی کا پھندا اور بلا سمجھتے تھے۔ جبکہ ان کی بیگم انہیں ''اے ہے نوج!'' کہہ کر مخاطب بھی نہیں کرتی تھیں اور ان کی ڈومنی اور مئے نوشی کو ڈپلومیٹک خاموشی کے ساتھ نظر انداز بھی کرتی تھیں۔

مردوں کی ایک اور قسم وہ ہوتی ہے جو بیوی کی نوج سے تنگ آ کر کسی اور معشوق

کی زلف گرہ گیر میں منہ چھپانے کا حوصلہ اور استطاعت بھی نہیں رکھتے اور کسی عبادت گاہ میں پناہ ڈھونڈ تے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ عبادت گاہوں کی رونقوں میں بھی بیویوں کا پوشیدہ ہاتھ کارفرما ہے......

فرمائشیں ہیں نت نئی، ہر روز ہائے ہائے
دم ناک میں ہے منے کی اماں کیے ہوئے
جی چاہتا ہے اب کسی مسجد میں جا کے ہم
"بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے"

کیا آپ نے کبھی غور فرمایا ہے کہ مختلف مرد مختلف وجوہات کی بنا پر زن مریدی قبول کرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ مرد تو زن مریدی قبول کرنے سے پہلے اس کے لیے معقول جواز پہلے سے ڈھونڈ رکھتے ہیں۔ آپ نے وہ پرانا لطیفہ تو ضرور سنا ہوگا کہ جب دو سہیلیاں ایک طویل عرصہ بعد ایک دوسرے سے ملیں تو ایک نے دوسری سے کہا۔ "کیا بات ہے، پچھلی مرتبہ تم ملی تھیں تو بہت اداس تھیں اور اپنے شوہر کی معمولی ملازمت اور کم تنخواہ کا رونا رو رہی تھیں اور آج ملی ہو تو قیمتی لباس پہن رکھا ہے اور خوش وخرم دکھائی دے رہی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے شوہر نے پہلی ملازمت چھوڑ دی ہے۔" دوسری نے اٹھلا کر جواب دیا۔ "نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنا پہلا شوہر چھوڑ دیا ہے۔"

شادی شدہ زندگی ہنسی خوشی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ شوہر بیوی سے ڈرتا رہے۔ اس طرح سے کم از کم بیوی کی شادی شدہ زندگی ہنستے کھیلتے گزرتی ہے۔ بہت سے ذی فہم شوہر جو بیوی سے ڈرتے رہنے کی جرأت نہیں رکھتے، وہ بھی بیوی کو یقین دلاتے رہتے ہیں کہ وہ ان سے (بیویوں سے) ڈرتے ہیں اور بیویاں بھی جواباً انہیں وفاداری کے وعدے سے خوش رکھتی ہیں۔ اس اداکاری بہ شرط استواری سے دونوں میاں بیوی عمر بھر خوشیوں کے جھولے میں جھولتے رہتے ہیں۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ اس جھولے میں ان کی ہم نشینی کا شرف کسے حاصل ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے کسی مفکر کا قول ہے کہ جو شخص اپنی

بیوی سے نہیں ڈرتا، نہ صرف اس کی شرافت میں شبہ ہے بلکہ اس کے کامیاب شوہر ہونے میں بھی شک ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، (اور وہ کیوں جھوٹ بلوائے گا؟) ہم ایک ایسے میاں بیوی کو بھی جانتے ہیں جو بالکل نہیں جھگڑتے اور جھگڑا نہ کرنے کی وجہ سے شوہر و بیوی دونوں کی صحت ہمیشہ اچھی رہتی ہے۔ ہماری اس دانشمندانہ بات پر چونکیے نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میاں بیوی نے برسوں پہلے یہ طے کرلیا تھا کہ جب کبھی جھگڑنے کی نوبت آجائے دونوں میں سے ایک کچن میں چلا جائے اور دوسرا (یا دوسری) فوراً گھر سے باہر چلا جائے۔ اب دونوں میں کبھی کبھی اس بات پر تکرار ہو جاتی ہے کہ رفع شر کی خاطر کون کچن میں جائے گا اور کون گھر سے باہر، یہ طے کرنے کے لیے انہیں پڑوسیوں کی مدد بھی لینی پڑتی ہے۔ اس معاہدے کی رو سے دونوں میاں بیوی نے عمر عزیز کا بیشتر حصہ تنہا باہر گھومنے پھرنے میں گزارا ہے جس کے خوش گوار اثرات ان کی صحت پر پڑے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اگر ہمدرد دنیا کو یہ پتہ چل جائے کہ آپ بیوی سے جدا ہو کر مغموم گھوم رہے ہیں تو یہی دنیا آپ کے آنسو پونچھنے کی خاطر کئی لیڈیز رومال بھی آگے بڑھا دیتی ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں آبرو اور تندرستی، دونوں محفوظ رہ جائیں، یہ ناممکن ہے۔ جبھی تو نظیر اکبر آبادی فرما گئے ہیں......

جتنے سخن ہیں، سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو رکھے اور تن درست

آپ نے وہ پرانی کہاوت تو یقیناً سنی ہوگی کہ شادی ایک ایسا لڈو ہے جسے نہ کھانے والا بھی اتنا ہی پچھتاتا ہے جتنا کہ کھانے والا۔ حقیقت یہ ہے کہ لڈو اور بیوی دونوں ہی سے مرد کا دل بہت جلد بھر جاتا ہے اور پھر وہ دوسری مٹھائیوں کے لیے للچانے لگتا ہے۔ اسی لیے تیز وطرار لڑکیاں ایسا شوہر تلاش کرتی ہیں جو شتر مرغ کی طرح ہو۔ شتر مرغ کے بارے میں مشہور ہے کہ اسے بہت کم دکھائی دیتا ہے اور جو کچھ بھی اسے کھانے کے لیے دیں، ہضم کرلیتا ہے......

○○

ناکام تقریروں سے متعلق ایک تقریر

دُنیا میں جتنے مشہور مقرر گزرے ہیں، وہ سب کے سب ابتدا میں ناکام تقریریں کیا کرتے تھے۔ وہ لوگوں کے اژدہام سے ڈر جایا کرتے تھے۔ پھر بھی تقریر کیا کرتے تھے۔ اس لیے کامیاب مقرر بننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے ایک ناکام مقرر بننا سیکھیں۔ مرزا غالبؔ فرماتے ہیں......

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہ شعر دراصل ایک ناکام تقریر کی تعریف ہے۔ ظاہر ہے اگر ہم اپنی تقریر میں وہ باتیں کہیں گے جو دوسرے پہلے سے جانتے ہیں تو یقیناً ہوٹنگ ہوگی اور لوگ شور مچانے لگیں گے۔ دراصل مرزا غالبؔ کو جس دن شراب میسر نہیں ہوتی تھی، وہ اسی قسم کے شعر کہا کرتے تھے۔

مشہور مصنف ڈیل کارنیگی نے اپنی کتاب ''گفتگو اور تقریر کا فن'' میں لکھا ہے کہ آپ کبھی بھی اپنی تقریر کو اسکول کے بچے کی مانند لفظ بہ لفظ زبانی یاد نہ کریں۔ ہمارے خیال میں یہ مشورہ اس لیے درست ہے کہ بچوں کی رٹی رٹائی تقریروں میں جتنی غلطیاں ہوتی ہیں، ان کی وجہ سے ان اسکول ٹیچروں کی بڑی بے عزتی ہوتی ہے جنھوں نے وہ تقریر طالب علم کو لکھ کر دی ہوتی ہے۔ استاد کی بے عزتی کرنے سے تو بہتر ہے کہ ہم خود

ہی ایک خراب تقریر کر لیں۔ ممکن ہے جب آپ تقریر کر رہے ہوں، جج صاحبان نیند کے مزے لوٹ رہے ہوں اور آپ ہی کو پہلا انعام مل جائے۔

کہتے ہیں کہ اچھی تقریر وہ ہوتی ہے جو سامعین کو اپنی طرف کھینچے۔ گو کہ ہمیں فوری طور پر اچھا مقرر نہیں بننا ہے، پھر بھی لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے ہم یہ کر سکتے ہیں کہ نئے فیشن کا ایسا نیا لباس پہنیں کہ لوگوں کی نگاہیں ہمارے لباس پر ہی ٹکی رہیں۔ ان کی قوت سماعت عارضی طور پر سہی، بیکار ہو جائے اور انہیں تقریر سنائی ہی نہ دے۔ اس کے لیے رنگین جوتوں اور جدید ترین ہیئر اسٹائل کی مدد بھی لے لی جائے تو سونے پر سہاگہ ثابت ہوگا۔ بہت سی خواتین جب کہیں تقریر کرتی ہیں تو اپنا سارا زور بیاں تقریر کی بجائے میک اپ پر صرف کر دیتی ہیں اور دوران تقریر اپنی ہیرے کی انگوٹھی کو ایک خاص ادا سے بار بار یوں لہراتی ہیں کہ سامعین کی آنکھیں اور ججوں کی قوت فیصلہ چندھیا جائے۔ جن کے پاس ہیرا نہ ہو، وہ اپنے اوپر قیمتی پرفیوم کا چھڑکاؤ کر لیتی ہیں، تاکہ آپ کی قوت شامہ بھی بیکار ہو جائے اور آپ انہیں دیکھ کر ہی تالیاں بجاتے رہیں۔ یہ خواتین بہت اچھی طرح جانتی ہیں کہ ایک میلا کچیلا پاگل شخص راستہ پر کھڑے ہو کر کتنی ہی سمجھداری کی باتیں کیوں نہ کرے، لوگ توجہ نہیں دیتے لیکن ایک خوش لباس اور خوش شکل شخص کی بے معنی تقریر فوراً تعریف اور ایوارڈ، دونوں حاصل کر لیتی ہے۔

کبھی کبھی تقریر کے دوران ایسا موقع آتا ہے کہ آپ بہت زیادہ گھبرا جاتے ہیں، ذہن سے خیالات گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو جاتے ہیں اور آپ خالی نظروں سے سامعین کو یوں گھورنا شروع کر دیتے ہیں جیسے انہوں نے ہی آپ کے خیالات چرا لیے ہوں۔ ایسی حالت میں آپ جتنی دیر خاموش کھڑے رہیں گے، اتنا ہی لوگ خوش ہوں گے اور خوشی کے مارے تالیاں بجانا شروع کر دیں گے۔ گویا کہہ رہے ہوں کہ تمہاری خاموشی تمہاری تقریر سے زیادہ بامعنی ہے۔ ایسے ذہین سامعین کو شکست دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جیسے ہی آپ اپنی تقریر بھول جائیں اور کچھ یاد نہ آئے تو فوراً سنبھل کر کہئے ...... "سامعین کرام، میری خاموشی کا غلط مطلب نہ لیں۔ یہ نہ سمجھیں کہ

میں تقریر بھول گیا ہوں۔ جب میں نے تقریر یاد ہی نہیں کی تو اسے بھولنے کا سوال ہی کہاں اُٹھتا ہے۔ دیکھئے میر یا غالبؔ کا شعر مشہور ہے......

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

دوستو! یہی وہ دھواں ہے۔ جس نے ہمارے شہر میں فضائی آلودگی بڑھادی ہے۔ اس کے علاوہ ایک صوتی آلودگی ہوتی ہے جو شور مچانے اور تقریریں کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے میں اپنی تقریر یہیں ختم کرتا ہوں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

سامعین کرام، اگر آپ یہ جملے اور اشعار یاد کرلیں تو تقریر بھول جانے پر انہیں بآسانی دہرا سکتے ہیں اور اپنی تقریر کو کامیابی کے ساتھ ناکامی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ یاد رکھئے، آپ کی تقریر جتنے کم لوگوں کی سمجھ میں آئے گی، آپ کی شہرت اتنی ہی زیادہ بڑھے گی اور آپ اسمبلی اور پارلیمنٹ میں بھیجے جانے کے لائق سمجھے جائیں گے۔

فن تقریر پر عبور حاصل کرنے کے لیے مشق اور مسلسل مشق کرنا ضروری ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر آپ کسی آدمی کو بلا قصور مکا رسید کردیں تو وہ شخص ردعمل کے طور پر آپ سے جو کچھ بھی کہے گا وہ فطری تقریر کا نمونہ ہوگا۔ لیکن اس مشق میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ مدمقابل کوئی ایسا پہلوان نہ ہو۔ جس کا جوابی مکہ آپ کو کسی بھی مشق کے لائق نہ رہنے دے۔ اس لیے لڑائی کے ذریعے تقریر سیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ کمزور ساتھی کا انتخاب کیا جائے اور اس کے ساتھ روزانہ کسی بہانے فساد برپا کیا جائے۔ دنیا کی بے شمار عورتوں نے اسی فارمولے پر عمل کرکے فن تقریر میں مہارت حاصل کی ہے۔

اب لگے ہاتھوں ہم آپ کو ناکام تقریروں کی کچھ قسمیں بھی بتائے دیتے ہیں تاکہ ہماری تقریر بھی کچھ طویل ہوجائے اور ناکامی کی منزل کو چھولے۔ ناکام تقریر کی سب سے پہلی قسم وہ ہوتی ہے۔ جس میں شادی سے پہلے لڑکا لڑکی کی تعریف میں تقریریں

کرتا ہے اور لڑکی آنکھیں بند کر کے لڑکے کی بیوقوفی پر دل ہی دل میں مسکراتی ہے۔ پھر شادی کے فوراً بعد لڑکی اپنے شوہر کو نصیحتوں اور ڈانٹ پھٹکار بھرے خطبہ سے نوازتی ہے اور شوہر دم دبائے اسے سہتا رہتا ہے اور کچھ عرصہ بعد میاں بیوی دونوں باآواز بلند تقریری مقابلہ کرتے ہیں اور سارا محلّہ انہیں سنتا ہے۔ آپ کہیں گے بہت پُرانا لطیفہ ہے۔ درست ہے، اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب لڑکا اور لڑکی شادی سے پہلے ہی اولین دو تجربوں سے گزر چکے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اب ان کے جھگڑنے اور ایک دوسرے پر برتن پھینکنے کی آوازیں شادی میں آئے ہوئے دور دراز کے وہ مہمان بھی سن لیتے ہیں جو شادی کی رات لڑکے والوں کے یہاں قیام کر لیتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، امریکہ میں تو سنا ہے دولہا دلہن چرچ سے باہر آتے آتے اتنا لڑ لیتے ہیں کہ گھر پہنچنے سے پہلے طلاق نامہ پر دستخط بھی کر دیتے ہیں۔

دوسری قسم کی ناکام تقریر وہ ہوتی ہے جو اسکول کے بچے تقریری مقابلوں میں کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے چابی بھرے گڈے اور گڑیاں ہیں جو دونوں ہاتھ اور گردن ہلا ہلا کر بغیر سمجھے مشکل الفاظ کا دریا بہا رہے ہوں۔ یادش بخیر، ہم جب اسکول میں پڑھتے تھے، ہمارے ہیڈ ماسٹر نے ایک دن ہمیں بلا کر کہا۔ ''اگلے ہفتہ تمہیں انٹر اسکول تقریری مقابلے میں حصہ لینا ہے۔ عنوان ہے ''وہ دیکھو ہوائی جہاز آ گیا۔'' جاؤ جا کر اپنے کلاس ٹیچر سے تقریر لکھوالو۔'' ہم نے کلاس ٹیچر کو عنوان بتایا تو ان پر رقت طاری ہو گئی۔ بہت دیر سوچتے رہے۔ پھر کہنے لگے۔ ''جاؤ، اپنے ابا سے لکھوالینا۔'' ابا جان کے پاس پہنچے تو انہوں نے عنوان دیکھ کر ایک تبسم فرمایا اور کہنے لگے۔ ''بھئی، میں تو کتابوں کا کاروبار کرتا ہوں، ہوائی جہاز کے بارے میں کیا جانوں۔ کل مولوی صاحب آئیں گے، وہ لکھ دیں گے۔'' اگلے روز مولوی صاحب نے آدھ منٹ آنکھ بند کر کے دنیا کی بے ثباتی پر غور فرمایا اور اگلے آدھ گھنٹے میں ایک انتہائی گاڑھی اور ثقیل مذہبی تقریر لکھ دی۔ عنوان وہی تھا...... ''وہ دیکھو ہوائی جہاز آ گیا''۔ آج بھی جب کبھی ہم کسی انٹر اسکول تقریری مقابلے میں جاتے ہیں تو طرح طرح کے غیر مذہبی عنوانات پر مذہبی تقریریں سن کر ہمیں اپنے

بچپن کے مولوی صاحب یاد آجاتے ہیں۔

ناکام تقریر کی ایک اعلیٰ قسم وزیروں اور سیاستدانوں کی ہوتی ہے جو لیڈر جتنا کم پڑھا لکھا ہوتا ہے، اتنی ہی طویل تقریر کرتا ہے اور پوری طاقت سے چیخ چیخ کر یوں کرتا ہے جیسے خالی برتن بج رہا ہو۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایسی ہی ایک اکتا دینے والی تقریر سے ایک خاتون اتنی خفا ہوئی کہ انہوں نے کھڑے ہوکر وزیر محترم سے غصے میں کہا۔ ''اگر آپ میرے شوہر ہوتے تو میں آپ کو زہر دے دیتی۔'' وزیر محترم پہلے تو پریشان ہوئے، پھر سنبھل کر فرمایا۔ ''محترمہ، اگر آپ میری بیوی ہوتیں، تو میں خود ہی زہر کھالیتا۔''

ہمارے ملک کے کچھ اعلیٰ ترین اور اعظم ترین وزیر تو ایک ہی موضوع پر تین تین تقریریں تیار رکھتے ہیں اور سامعین کی پسند ناپسند کے مطابق ان کا استعمال کرتے ہیں۔ یعنی امریکہ میں پہلی تقریر کرتے ہیں، گجرات میں دوسری تقریر استعمال کرتے ہیں اور گوا جاکر اپنی تیسری امن پسند تقریر فرماتے ہیں، مزاحیہ ناکام تقریروں کے لیے البتہ بہار کے وزیر اور سیاستداں مشہور ہیں جن کی تقریریں سننے اور دیکھنے، دونوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

انٹر کالجیئٹ تقریری مقابلوں میں جو حضرات جج کے فرائض انجام دیتے ہیں، وہ عام طور پر فن تقریر سے مکمل طور پر ناواقف ہوتے ہیں۔ چنانچہ مقابلے کے بعد وہ خود تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کے ہاتھ پیر کانپ رہے ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہ مقابلے عموماً سردیوں کے موسم میں منعقد کئے جاتے ہیں تاکہ الفاظ اور جسم کی تھرتھراہٹ کی ذمہ داری موسم کے سر ڈالی جاسکے۔ منتظمین احتیاطی تدبیر کے طور پر مقابلے کے نتائج کا پرچہ اس جج کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں جو سب سے ناکام اور طویل تقریر کرتا ہے تاکہ نتائج کے خوف اور شوق کے مارے طلبہ ان کی تقریر کو صبر کے ساتھ برداشت کریں۔ لیکن اس میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ چونکہ یہ جج حضرات خود اچھی تقریر نہیں کرسکتے، اس لیے وہ طلبہ کی اچھی تقریروں کی قدر کرتے ہیں اور غیر جانبداری سے فیصلہ سناتے ہیں۔

اب ہم اس ناکام تقریر کا بیان کرتے ہیں جسے کم وبیش ہر کس وناکس کو لازمی طور پر بار بار سننا پڑتا ہے۔ یہ تقریر والدین کی ہوتی ہے جو عمر بھر ہماری انگلی تھامے ہمیں

غلطیوں اور لغزشوں سے بچانے کی ناکام کوشش کرتی ہے اور جسے سن کر تعلیم یافتہ نوجوان
بقول اکبرالہ آبادی اپنے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں۔ مگراب زمانے نے ایسی کروٹ بدلی ہے
کہ والدین کے پاس بچوں کے لیے بالکل وقت نہیں رہا۔ اس لیے اب وہ اپنی اولادوں
کو ناصحانہ تقریروں کی بجائے ٹی۔وی، ویڈیو، کیبل اور انٹرنیٹ کے حوالے کردیتے
ہیں اور انہیں قیمتی پوشاکیں، گاڑیاں دلا کر اور انکل چپس اور میکڈونالڈ پیزا کے لیے
ہزاروں روپے ماہوار دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ عیش وعشرت کی ان اشیاء کا سب
سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے نوجوان طویل تقریروں سے بچ جاتے ہیں اور ساتھ
ہی ساتھ ان خوشیوں اور ان دکھوں سے بہت جلد آشنا ہو جاتے ہیں جن سے انہیں بیس
برس بعد آنکھیں چار کرنا تھا۔ ناکام تقریر کی اس سے بڑی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

○○

خاکے / تبصرے

ایک تھا بادشاہ..........!

بچپن میں دادی اماں کی ہر کہانی کی ابتدا کچھ یوں ہوتی تھی۔ ''بچو! ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ!'' میں یہ سنتے ہی بے چین ہو جاتا تھا۔ ''دادی اماں بادشاہ خدا کیسے ہوسکتا ہے؟ خدا تو سب بادشاہوں سے بہت بڑا ہوتا ہے!'' دادی اماں جھنجھلا جاتیں ''بھئی بیچ میں مت ٹوکو۔ خدا کے بعد اس دنیا میں غریب رعایا کا سب کچھ بادشاہ ہی ہوتا ہے۔ رحم دل، بہادر، سخی، عظیم۔'' مگر میرا دل کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ ''بادشاہ خدا کیسے ہوسکتا ہے؟''

پھر کہانیوں میں جنگل کے بادشاہ شیر کے قصے پڑھے جس سے سب جانور ڈرتے بھی تھے اور اپنی مصیبتوں میں اس سے مدد کے طلب گار بھی ہوتے تھے۔ اس کی بادشاہت کو چیلنج کرنے والا کوئی بھی نہ ہوتا تھا۔ وہ مکاروں کو سزا بھی دیتا تھا اور نیکوکاروں کو انعام واکرام سے بھی نوازتا تھا۔

پھر ایک دن امی جان نے سب بچوں کو جمع کر کے پوچھا۔ ''چیست آن چیزے کہ من ہر روز می بینم وگاہے شاہ می بیند و ربّ العالمین ہرگز نمی بیند۔''

ہم سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ''وہ کون سی چیز ہے جو میں ہر روز دیکھتا ہوں، بادشاہ کبھی کبھی دیکھتا ہے اور رب العالمین کبھی نہیں دیکھتا۔''

''ایسی تو کوئی چیز نہیں ہے۔'' ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

''ہے بچو ہے۔ وہ ہے دوست۔ ہم سر، ہم منصب، جسے ہم روز دیکھتے ہیں،

بادشاہ کبھی کبھی دیکھتا ہے اور ربّ العالمین کے برابر تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔''

''بے چارہ بادشاہ!'' میں نے سوچا۔ ''اس کا وقت کیسے کٹتا ہوگا؟ دوست کے انتظار میں وہ برسوں اکیلا اور تنہا کیسے رہتا ہوگا؟ بادشاہ ہونا کوئی گڈے گڑیوں کا کھیل نہیں ہے۔ سب کام اکیلے کرنے پڑتے ہیں۔ اسی لیے بادشاہ یا تو بہت رحم دل ہو جاتے ہیں یا بہت ظالم!''

پھر ذرا بڑے ہوئے تو چوری چھپے فلم ''مغل اعظم'' دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پتہ چلا کہ بادشاہ مجبور و بے بس بھی ہوتے ہیں۔ ایک کنیز کے دل فریب حسن اور ہوش ربا رقص سے مسحور تو ہو سکتے ہیں لیکن اسے اپنے ولی عہد سے محبت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ پھر مغلیہ تاریخ پڑھی تو پتہ چلا کہ مغل اعظم اور انارکلی تو محض افسانہ تھا ورنہ اکبر سچ مچ ایک اسم بامسمیٰ بادشاہ تھا جس نے نہ صرف اپنی سلطنت کو وسیع اور مضبوط تر کیا بلکہ اپنے برادران وطن اور خواہران وطن کا جس قدر اور جس طرح سے خیال رکھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مغل بادشاہوں کے دور حکومت کا سارا کریڈیٹ ابراہیم لودھی کی فوج کے ان ہاتھیوں کو جاتا ہے جنہوں نے بابر کی فوج کی بجائے اپنوں ہی کو کچل دیا تھا۔ اگر ان ہاتھیوں نے یہ کارنامہ انجام نہ دیا ہوتا اور ۱۵۲۶ء کی پانی پت کی جنگ میں بابر کو شکست ہو جاتی تو ۱۶۵۳ء میں نہ تاج محل مکمل ہوتا اور نہ ۱۹۶۳ء میں ہم فلم ''مغل اعظم'' دیکھ پاتے۔

آج سے ٹھیک تین ماہ قبل ایک پروگرام کے سلسلے میں مسقط جانا ہوا جو عمان کی راجدھانی ہے۔ ایئرپورٹ سے ہوٹل کے سفر کے دوران عالیشان عمارتوں، ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے فلائی اوور، چوڑی اور انتہائی صاف ستھری سڑکوں اور جنت نظر سبزہ زاروں نے موسم کو مزید خوشگوار بنا دیا تھا۔ ٹرافک اتنا کم جیسے پچاس برس پُرانی ہندوستانی فلم میں میرین ڈرائیو کا منظر دیکھ رہے ہوں۔ کار مالکان اور ڈرائیور اتنے مہذب اور شریف کہ کسی موڑ پر سامنے سے کوئی گاڑی آرہی ہوتی تو دونوں گاڑیاں ایک دوسرے کے احترام میں بالکل دھیمی ہو جاتیں اور دونوں ایک دوسرے کو ''پہلے آپ، پہلے آپ'' کا

اشارہ کرنے لگتے۔ میں نے سوچا اگر یہاں دتی کی ایک ٹیکسی اور ممبئ کا ایک آٹو رکشا لا کر چھوڑ دیا جائے تو مسقط والوں کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ اتنے مہذب معاشرے میں تو ہم ہندوستانیوں کا دم گھٹ جائے۔ صاف و شفاف سڑکوں اور شجر سایہ دار کے جال کو دیکھ کر ہمیں شیر شاہ سوری کی یاد آ گئی جس نے جنگل کے شاہ کو تن تنہا مار کر شیر خان کا خطاب حاصل کیا تھا اور اپنے دور حکومت میں نہ صرف شاہراہیں بنائیں، ان کے کنارے گھنے پیڑ لگائے بلکہ مسافروں کے آرام کے لیے ہزاروں سرائیں بھی قائم کی تھیں۔

دفاتر، شوروم اور مالز کی طلسماتی فضا سے باہر نکل کر رہائشی علاقے سے گزر ہوا تو خوبصورت سفید مکانات کو کرکٹ کھلاڑیوں کی طرح دور دور ایستادہ دیکھا تو حیرت ہوئی۔ سڑکوں کی دونوں جانب صاف اور چمکدار فٹ پاتھوں کو دیکھ کر ہماری آہ نکل گئی۔ غیر قانونی جھونپڑوں اور پھیری والوں کے بغیر وہ کتنے سونے سونے معلوم ہو رہے تھے۔ ہم نے اپنے میزبان سے پوچھا۔ ''آپ کے یہاں آبادی کا بڑا مسئلہ ہے۔ بھیڑ بھاڑ کے بغیر آپ لوگ کیسے جی لیتے ہیں؟''

کہنے لگے۔ ''مسقط ہی نہیں، پورے عمان کی آبادی کسی بھی زمانے میں گنجان نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قابل کاشت زمین کا رقبہ بہت کم ہے۔'' ہم چپ ہو رہے۔ پتہ نہیں قابل کاشت زمین سے ان کی کیا مراد تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ عمان میں صحرا ہے، سمندر ہے، پہاڑوں کے سلسلے ہیں، وادیاں ہیں، سبزہ زار ہیں، نخلستان ہیں، یعنی مجنوں کی دل بستگی کے سارے سامان ہیں جو صدیوں سے حملہ آوروں کے سامنے رکاوٹ بنے رہے اور قدرتی دیوار کی طرح عمان کو محفوظ رکھا۔

ہم نے اپنے غیر مسلم میزبان سے پھر دریافت کیا۔ ''آپ اتنے بڑے سرکاری عہدے پر فائز ہوتے ہوئے بھی خود گاڑی چلاتے ہیں۔ ڈرائیور کیوں نہیں رکھ لیتے؟''

''جب ہمارے سلطان خود اپنی گاڑی چلانے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے تو میں کیوں کروں؟'' انہوں نے جواب دیا۔ ''یہی نہیں، سلطان قابوس کبھی کبھی خلیفہ ہارون الرشید کی طرح راتوں کو تن تنہا اپنی گاڑی میں شہر کے حالات کا معائنہ کرنے بھی

نکل جاتے ہیں۔"

بوستان پیلس انٹر کانٹی نینٹل کے دروازے پر کار رُکی تو ہم نے ہوٹل کی عظیم الشان عمارت اور اس کی غیر معمولی سجاوٹ کو دیکھ کر پوچھا۔ "مسقط تو خوابوں کی سرزمین معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے تو اس کے بارے میں اپنے بچپن میں کچھ اور سنا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے بدل گیا؟" مسکرا کر کہنے لگے۔ "آپ کا بچپن غالباً ستر کی دہائی میں اپنے شباب پر ہوگا جب واقعی مسقط کیا سارا عمان ایک ویرانہ ہی تھا۔ تیل کے ذخیرے دریافت ہو جانے کے باوجود ترقی کی راہیں کھلی نہ تھیں۔ پکی سڑکیں، اسپتال، اسکول، کچھ بھی نہ تھے۔ پورے عمان میں اسکولی طلبہ کی تعداد صرف نو سو تھی۔"

ہمیں اپنے شہر کے خستہ میونسپل اسکولوں کے برآمدوں میں بیٹھے سینکڑوں غریب طلبہ کی یاد آ گئی۔ ہوٹل کی وسیع و عریض جگمگاتی لابی میں داخل ہوتے ہوئے ہم نے آخری سوال کیا۔ "پھر یہ کایا کلپ کیسے ہوگئی؟" کہنے لگے۔ "کچھ نہیں۔ عمان کے سلطان سعید بن تیمور کے صاحبزادے، شہزادہ قابوس برطانیہ سے جدید علوم اور ملٹری کی تربیت حاصل کر کے مسقط لوٹے اور والد محترم سے کہہ دیا کہ آپ کا طرز حکومت پُرانا ہو چکا۔ اب گلوں میں رنگ بھرنے اور بادِ نو بہار چلنے کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ اس لیے آپ براہِ کرم عنانِ حکومت خاکسار کے حوالے کریں تا کہ گلشن کا کاروبار چلے اور پھر جو اگلے تیس برسوں میں صبح نو نمودار ہوئی، اُسے آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔"

اب جو سیرگی پلیخانوف کی کتاب "مصلح فرماں روا قابوس بن سعید، سلطان عمان" ہمیں ملی تو ہم نے سب سے پہلے اس اقتدار کی منتقلی کا باب ڈھونڈ نکالا۔ صفحہ ۱۸۶ پر، سلطان قابوس بن سعید کا یہ قول درج تھا......

"میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے ذاتی تعلقات کو بھول جاؤں۔ مسئلہ باپ بیٹے کے رشتے سے بڑا تھا۔ مسئلہ پوری اُمت کا تھا۔ میرے اوپر اپنے احساسات اور جذبات کو نظر انداز کرنا واجب ہو گیا تھا۔"

یہ پڑھ کر معاً ہمیں خیال آیا کہ ۱۹۷۰ء میں جو ذہنی کیفیت شہزادہ قابوس کی تھی،

شاید وہی ذہنی حالت ۱۶۵۸ء میں عالمگیر اورنگ زیب کی بھی رہی ہو جب اس نے عنان حکومت شاہجہاں سے لے لی تھی اور راستہ روکنے والے بھائیوں کو بھی راستے سے ہٹا دیا تھا۔ تاریخ نہ صرف اپنے آپ کو دہراتی ہے بلکہ بعض اہم اور بڑے تاریخی فیصلے انسان نہیں کرتا، خود قدرت کرتی ہے!''

حضرات! عام طور پر کسی کتاب کی رسم اجراء کی تقریب میں سب سے اچھی تقریر وہ شخص کرتا ہے جس نے کتاب بالکل نہ پڑھی ہو لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ خاکسار نے ۳۸۴ رصفحے کی اس خوبصورت کتاب کی ایک ایک سطر کو دھیان سے پڑھا ہے اور ۸۴ رصفحات پر مشتمل البم کی ہر تصویر کو غور سے دیکھنے کے بعد حق نمک ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں اس تقریب کے بعد عشائیے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ حیرت انگیز طور پر یہ تالیف ایک ایسے روسی قلم کار اور صحافی کے زور قلم کا نتیجہ ہے جو بادشاہوں اور سیاسی رہنماؤں کے بارے میں سوانحی کتابیں لکھنے میں ید طولی رکھتے ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف سلطان قابوس بن سعید کی سوانح حیات ہے بلکہ قدیم عمان کی مفصل تاریخ اور جغرافیائی حالات کی دستاویز بھی ہے۔ اس کتاب میں فاضل مولف نے تاریخ کو افسانوی انداز میں اور جغرافیائی حالات کو خوبصورت رومانوی منظر نگاری سے سجا کر جس انداز میں پیش کیا ہے، اگر اسی انداز سے ہماری درسگاہوں کی تاریخ اور جغرافیہ کی کتابیں لکھی جاتیں تو طلبہ نہ صرف ان مضامین سے جی نہیں چراتے بلکہ اس کے رومانی اقتباسات اپنی غیر درسی سرگرمیوں کے لیے بھی حفظ کر لیتے۔ اس کتاب کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں اسلامی تاریخ کو خلفائے راشدین کے عہد تک تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے خصوصاً یہ کتاب ہمارے ان نوجوانوں کے لیے بے حد مفید ہے جو مذہبی رسوم ورواج کے تو سختی سے پابند ہیں مگر انہیں خلفائے راشدین کے نام یاد نہیں ہیں۔

ہمیں اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ۱۸۵۰ء تک عمان کے فرماں روا امام کہلاتے تھے اور ان کی باقاعدہ بیعت کی جاتی تھی۔ محقق جے سی ولکنسن نے اپنی

کتاب ''عمانی امامت کی روایات'' میں امامت کے ان مسلمہ معیاروں کو بیان کیا ہے جن کو اس اعلیٰ ترین منصب سنبھالنے کے لیے لازمی قرار دیا گیا تھا۔ ہم نے ان معیاروں کو انتہائی دلچسپی اور عقیدت کے ساتھ پڑھا اور ہر معیار پر اپنے پیارے وطن کے موجودہ رہنماؤں کو بلاتفریق مذہب وملت پرکھتے بھی گئے۔ اب آپ بھی اس عمل میں ہمارے شریک ہو جائیں۔ وہ لکھتا ہے۔

''امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ بردبار اور ہوشیار ہو۔ اندھا نہ ہو، بہرہ نہ ہو، بہت بوڑھا نہ ہو، ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے نہ ہوں۔ اسی طرح خصی اور عاجز نہ ہو، اس کی عقل میں کوئی خلل نہ ہو، کند ذہن نہ ہو۔ یہ ضروری ہے کہ وہ حاسد، بزدل، لالچی اور جھوٹا نہ ہو۔ عہد اور وعدے کا لحاظ کرتا ہو، معاہدوں کی پابندی کرتا ہو، اسی طرح دوسری اور قابل نفرت عادتوں سے پاک ہو۔ اس کا عالم اور طالب علم ہونا ضروری ہے۔''

اگر ہمارے ملک کی معزز عدالتیں ان شرائط کو معیار بنا کر ہمارے رہنماؤں کو ڈس کوالی فائی (Disqualify) کرنا شروع کر دیں تو ہمارے ایوانِ زیریں اور ایوان بالا، دونوں ہی تہہ وبالا ہو جائیں گے۔ اور جہاں آج حقیقتاً اُلو بولتے ہیں، وہاں محاورتاً اُلو بولنے لگیں گے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اگرچہ یہ ایک بادشاہ وقت کی سوانح حیات ہے اور اس میں شاہی نظام کی موافقت اور جمہوریت اور کمیونزم کی مخالفت میں صفحات کے صفحات سیاہ کئے گئے ہیں، لیکن سلطان عمان کے کارناموں کے ذکر میں کہیں بھی قصیدے کا رنگ نہیں جھلکتا ہے جو اس طرح کی سوانح کی عام کمزوری ہوتی ہے۔

جب مولف سلطان بن سعید کے دور حکومت میں بنائی گئی شاہراہوں، ہوائی اڈوں اور بندرگاہوں کی تعمیر کا ذکر کرتا ہے، مدرسوں، اسپتالوں، شفاخانوں، جدید طرز کے بازاروں کے قائم کرنے کی تفصیل بیان کرتا ہے، پانچ سوملین ڈالر کے صرفہ سے یونیورسٹی کے قیام کی اہمیت واضح کرتا ہے اور دنیا کے بیشتر ممالک سے سفارتی تعلقات کی بحالی کا

قصہ بیان کرتا ہے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ کسی بادشاہ کی فرضی خوبیوں کا قصیدہ نہیں، بلکہ ایک تعلیم یافتہ فرماں روا کی اقتصادی اور سیاسی اصلاحات اور اس کے لیے کی گئی جدوجہد کا مدلل، منطقی اور دلچسپ بیان ہے جس سے یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ دنیا میں کامیابی کسی کے لیے پھولوں کی سیج نہیں ہوتی۔

مجھے یقین ہے کہ آج سے پچاس برس بعد عمان کی دادیاں، نانیاں اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو جمع کر کے جب کہانی کا آغاز کریں گی...... ''بچو، ایک تھا بادشاہ!'' تو سارے بچے بہ یک زبان کہہ اُٹھیں گے...... ''ہمارا تمہارا خدا بادشاہ!''

○○
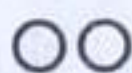
بندوں کو گِنا کرتے ہیں

کسی کتاب کی رسم اجراء کی تقریب منعقد کرنا جتنا مشکل کام ہے، اتنا ہی آسان کام کسی کتاب کو شائع کرنا ہے۔ جہاں یہ خبر نکلی کہ کتاب کی اسکرپٹ کہیں تیار ہو گئی ہے اور زیورِ طبع سے آراستہ ہونے کے لیے بے قرار ہے، بہت سے لوگوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ کبھی کسی اردو اکادمی کے سکریٹری کا فون آجاتا ہے کہ معقول کمیشن پر اکادمی سے مالی امداد حاصل کرلیں۔ کبھی مقامی کارپوریٹر کا ہرکارہ دوڑا چلا آتا ہے کہ اگر آپ صاحب کی تقریریں لکھنے کی ذمہ داری قبول فرمالیں تو آپ کی کتاب منصۂ شہود پر بلاتاخیر تشریف لاسکتی ہے۔ کبھی صبح چہل قدمی کرتے ہوئے جمن سیٹھ مل جاتے ہیں۔ ''اخاہ رائٹر صاحب! کہاں منہ لٹکائے چلے جارہے ہیں؟ ایسا لگتا ہے پھر کوئی کتاب چھاپنے کا پروگرام ہے۔ بھئی، ہم چھاپ دیتے ہیں آپ کو۔ اور کل سے آپ میرے چھ بچوں کو مفت ٹیوشن دینا شروع کردیں۔ کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے...... ہاہاہا!''

ان کے علاوہ کچھ گھاگ قسم کے اور پبلشرز ہوتے ہیں جو احمق اور متمول شاعروں اور ادیبوں کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتے ہیں اور ان کی ہر نئی تخلیق پر مبارکباد دینے ان کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ ''جسدن والا سیٹھ! آپ کا ہاتھ چومنے کو جی چاہتا ہے۔ اتنے بڑے ریستوران کے مالک ہونے کے باوجود آپ خود کچن میں کھڑے ہوکر باورچی کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور اسی ہاتھ سے صبح سویرے نثری نظمیں بھی لکھ لیتے

ہیں۔ اب بہت ہو چکا۔ اپنی ساری نظمیں مجھے دے دیجیے۔ میں آپ کا قیمتی شعری مجموعہ ایک ہفتہ میں شائع کر دوں گا۔"

لیکن اگر آپ کو درج بالا سہولتوں میں سے ایک بھی سہولت میسر نہ ہو تو پھر قرض دینے والوں کی نادانیاں، بیوی کی قربانیاں اور اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں شامل حال ہو جاتی ہیں اور مسوّدہ منتظر، لباس مجاز میں نظر آنے لگتا ہے۔ مگر جیسے ہی کتاب منظر عام پر آئی، غریب مصنف کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ غیر تو غیر، اپنے بھی یوں منہ پھیر لیتے ہیں جیسے ادیب و شاعر سے رشتہ داری ہونا سراسر کسر شان ہو۔ محلے والے دور سے دیکھ کر ہی راستہ بدل لیتے ہیں کہ نئی کتاب کا مصنف آرہا ہے، ابھی کتاب خریدنے کی فرمائش کرے گا۔ خریدو تو پیسوں کی بربادی، نہ خریدو تو مفت دے دے گا اور یہ اس سے بھی مہنگا سودا ہوگا کیونکہ پھر مفت میں رائے طلب کرے گا اور رائے کا مطلب ہے نری تعریف۔ بُرائی کرو تو آپ کے خلاف اخبار میں فرضی نام سے خطوط شائع کرائے گا۔

جمن سیٹھ بھی بات بات پر مصنف کم ٹیوٹر کے سامنے بچوں کو ڈانٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ "کمبخت جا، ماسٹر صاحب آگئے ہیں، پڑھنے بیٹھ۔ وہ کوئی مفت تھوڑا ہی پڑھانے آتے ہیں۔ یوں بھی آج کل کاروبار بہت مندا ہے۔ روز نقصان ہو رہا ہے۔"

ایسے میں صرف بیوی ہے جو دلاسا دیتی ہے۔ "آپ کیوں میرے زیورات کی واپسی کے لیے فکر مند ہیں؟ کتاب نہ بِکے تو کوئی بات نہیں، میں سمجھوں گی زیورات چوری ہو گئے۔ اب دیکھئے نا اپنی نوکرانی کے تمام زیور بھی تو اس کے نکمّے شوہر نے شراب کے لیے بیچ دیئے۔ مگر میں نے تو آپ کے شوق کے لیے خوشی خوشی اپنے زیور آپ کے حوالے کر دیئے تھے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اب تو آپ اور کتابیں نہیں لکھیں گے نا؟"

اتنا سب کچھ سہنے کے بعد ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے کہ کتاب کی رسم اجراء کا جلسہ منعقد کیا جائے۔ یہی وہ نازک لمحہ ہے جب مصنف اپنے آبا و اجداد کے ایک پُرانے غلط فیصلے پر سر پکڑ لیتا ہے کہ وہ تقسیم ہند کے وقت پاکستان کیوں نہ چلے گئے۔ وہاں آج

بھی کتاب کی رسم اجراء فائیو اسٹار ہوٹلوں میں انجام دی جاتی ہے، لنچ اور ڈنر پر لوگ ٹوٹے پڑتے ہیں، لاکھوں روپوں کے اشتہارات سے پھولا ہوا سوونیر شائع ہوتا ہے، بڑے نقاد کتاب پڑھے بغیر اس کی خوبیاں گناتے ہیں اور لوگ باگ دس گنا اور بیس گنا قیمت پر کتاب خرید کر خوش خوش گھر لوٹتے ہیں اور کتاب کو طاق نسیاں پر رکھ کر ٹی۔وی چینل آن کر دیتے ہیں۔

اِور ایک اردو کا ہندوستانی ادیب، جس کی کتاب کی رسم اجراء میں لوگ طوعاً وکرہاً آتو جاتے ہیں مگر کتابیں خریدنا تو دور، تحفتاً قبول کرنے میں بھی ایسا چہرہ بناتے ہیں جیسے یہ بوجھ ان سے کیسے اُٹھایا جائے گا۔

چونکہ برسوں پہلے ہم ان تمام مراحل سے بخیر وخوبی گزر چکے تھے، اس لیے جب مشتاق رضا کی کتاب ہمارے پاس اس حکم کے ساتھ آئی کہ اس کی رسم اجراء میں ہمیں شریک ہونا ہے تو ہم نے بہت ایمانداری کے ساتھ اسے پڑھنا شروع کیا اور جیسا کہ ہماری عادت ہے ہم روز رات کو دیر تک مطالعہ کرتے ہیں۔ چونکہ رسم اجراء میں ابھی سولہ دن باقی تھے اور کتاب کے مضامین پیش لفظ اور ایک ریٹائرڈ پروفیسر کے مقدمہ کو ملا کر یہ کل سولہ راتوں کی خوراک تھی، اس لیے ہم نے طے کیا کہ ہر رات ایک مضمون پڑھ کر دیکھیں گے کہ نیند آتی ہے یا اُڑ جاتی ہے؟ اور اگر نیند آتی ہے تو خواب کیسے آتے ہیں؟ اسی کو معیار بنا کر اپنی تقریر تیار کریں گے۔ مگر ساتویں رات کا ذکر ہے کہ ہم کتاب کے مطالعہ میں غرق تھے کہ بیگم کی آنکھ کھل گئی۔ کہنے لگیں۔ ''یہ آج کل آپ نے راتوں کو رومانی ناول پڑھنا کیوں شروع کر دیا ہے۔ یہ کوئی عمر ہے رومانی ناولیں پڑھنے کی؟''

ہم نے کہا۔ ''بیگم، عمر تو یہی ہے رومانی ناولیں پڑھنے کی، مگر آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ یہ رومانی ناول ہے؟''

کہنے لگیں۔ ''آج کل روز آپ خواب میں بڑبڑاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے نام بدل بدل کر مجھے پکار رہے ہیں۔ یہ اسی رومانی ناول کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ دیکھئے نا نام بھی کتنا رومانی ہے...... بُندوں کو گِنا کرتے ہیں۔''

ہم نے سر پیٹنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے بیگم کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ ''بیگم، اس کا نام ''بندوں کو گنا کرتے ہیں'' نہیں ہے بلکہ ''بندوں کو گنا کرتے ہیں'' ہے۔ اس میں خدا کے نیک بندوں کو گننے کی ترکیبیں لکھی ہوئی ہیں۔ بیگم آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھیں۔ ''مگر خدا کے نیک بندوں کو تو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے کتاب لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟'' ہم سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ کچھ دیر توقف کے بعد ایک سرد آہ بھر کر کہنے لگیں۔ ''اچھا تو یہ مذہبی کتاب ہے لیکن آپ تو پنج وقتہ نماز بھی نہیں پڑھتے۔ پھر یہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر مذہبی کتاب کیوں پڑھنے لگے ہیں؟ کہیں آپ کا ارادہ ہم سب کو داغِ مفارقت دینے کا تو نہیں ہے نا؟ آپ نے اس سال کا انشورنس پریمیئم بھی اب تک نہیں بھرا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''بیگم ہوش میں آیئے۔ ابھی ابھی تو ہم نے خضاب لگانا شروع کیا ہے، ہم کیسے آپ کو داغِ مفارقت دینے کی سوچ سکتے ہیں۔ اور یہ مذہبی کتاب نہیں ہے۔ عینک لگا کر غور سے دیکھیے۔ مصنف جانتا تھا کہ عورتیں کتاب کا نام پڑھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہوسکتی ہیں۔ اس لیے اس نے قوسین میں جلی حرفوں میں لکھ دیا ہے کہ یہ طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔''

کہنے لگیں۔ ''میں نہیں مانتی۔ اگر یہ طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہوتا تو اس کا نام ڈارون کی تھیوری کے مطابق ''بندروں کو گنا کرتے ہیں'' ہوتا۔ پھر میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپ اسے پڑھ کر ہنس رہے ہوں۔''

ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ''بیگم اصلی مزاح قہقہے نہیں لگاتا، زیرِلب تبسم تک ہی سمٹ جاتا ہے اور اس کتاب میں تو ہر مسکراہٹ کے پیچھے ایک آنسو چھپا ہوا ہے۔''

کہنے لگیں۔ ''لیکن یہ مزاح نگار اپنی کتاب کا نام رکھتے وقت اپنی بیویوں سے مشورہ کیوں نہیں کرتے۔ آپ نے بھی اپنی اکلوتی کتاب کا نام ''قند وزقند'' رکھا تھا۔ جس کے بارے میں بھائی مجتبیٰ حسین نے فرمایا تھا کہ یہ یونانی حکمت کی کوئی کتاب معلوم ہوتی ہے۔''

ہم نے انہیں آخری بار قائل کرنے کی کوشش کی۔ ''درست فرماتی ہیں آپ لیکن

یہ تو سیدھا سادا نام ہے اور ایک مشہور شعر سے لیا گیا ہے جس میں شاعر نے یہ کہا کہ جمہوریت میں بندوں کو گنا جاتا ہے، تولا نہیں جاتا۔"

کہنے لگیں۔ "تو یہ ان بندوں کا ذکر ہے جنہیں ہم ہر پانچ برسوں کے بعد ووٹ دے کر کامیاب بناتے ہیں اور پھر وہ ہمیں بھول جاتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک سمجھا آپ نے بیگم!" ہم نے اطمینان کی سانس لی۔

وہ تڑسے بولیں۔ "پھر تو اس کا نام "غنڈوں کو گنا کرتے ہیں" ہونا چاہیے۔"

اور اس طرح حسب معمول اس دوستانہ گفتگو میں ہم نے اپنی بیگم کو شکست دے دی کیونکہ اس کے بعد ہم خاموش ہو گئے ار مہذب اشخاص فتح یاب ہونے پر بالکل شور نہیں مچاتے۔ جہاں تک مشتاق رضا مصنف "بندوں کو گنا کرتے ہیں" کا تعلق ہے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ غیر معمولی شریف آدمی ہیں مگر سریع الاشتعال ہیں، یعنی انہیں غصہ بہت جلد آتا ہے۔ ان کی یہی دو خوبیاں یعنی شرافت اور غصہ ان کے کچھ مضامین سے جھلکتے ہیں جبکہ کامیاب مزاح نگاری کے لیے شرافت سے زیادہ شرارت اور غصہ کے اظہار کی بجائے غصہ کو پی جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سماج کی ناہمواریوں کو دیکھ کر فنکار کے اندر جو آگ سلگتی ہے اسی آگ میں تپ کر اس کا فن نکھرتا ہے اور کبھی طنز کبھی مزاح کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے بلکہ اکثر طنز و مزاح جڑواں بچوں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔

مشتاق رضا کے فن کے بارے میں مدیر "شگوفہ" حیدرآباد کی رائے یہ ہے کہ وہ اچھے طنز نگار ہیں۔ یوسف ناظم کا خیال ہے کہ ان کے مزاح میں افسانوی انداز رچا بسا ہے اور لطف دیتا ہے۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر مشتاق رضا کو طرزِ تحریر اور موضوعات کے انتخاب کے اعتبار سے پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کی قبیل کا قلمکار مانتے ہیں۔ ہم ان تینوں بزرگوں کے غیر مبالغہ آمیز افکار سے صد فیصد اتفاق کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں لیکن مشتاق رضا کی تحریروں پر مشتاق احمد یوسفی کا اتنا بڑا سایہ نظر آتا ہے کہ خود ان کا یعنی مشتاق رضا کا فن اس سائے میں چھپ جاتا ہے۔

مشتاق رضا اچھی زبان لکھنے کا ہنر جانتے ہیں، طنز و مزاح کے حربوں سے واقفیت رکھتے ہیں اور مستقل مزاجی کے ساتھ مزاح نگاری میں مصروف ہی نہیں ہیں بلکہ مطالعہ بھی کررہے ہیں۔ اگر ان کا یہی حال رہا تو کلاسیکی ادب کے رچاؤ اور موضوعات کے تنوع کے ساتھ مزید خوشگوار اندازِ تحریر میں مضامین نو کے ڈھیر لگاتے ہوئے اپنی شناخت خود بنالیں گے اور بہت جلد ہم ایسے سُست رفتار مزاح نگاروں کو کیفیت اور کمیت، دونوں اعتبار سے پیچھے چھوڑ جائیں گے۔ ہم مرحوم ضیاہاتی کے شکرگزار ہیں جنھوں نے مشتاق رضا کو یہ کہہ کر شاعری سے باز رکھا کہ ''میاں! شاعری وائری کے چکر میں مت پڑو، نثر نگاری پر توجہ دو۔'' اس نیک مشورے کا موصوف پر اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے دشت امکاں میں پہلا قدم افسانہ نگاری میں اور دوسرا قدم مزاح نگاری کے میدان میں رکھ دیا ہے۔

○○
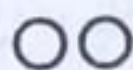
چور کی داڑھی میں 'مافیا'

آج ہم جس مافیائی دور میں ہنسی خوشی جیے جا رہے ہیں، اس میں پولیس مجرموں کے اور ادیب وشاعر نقادوں کے اشاروں پر رقص کرنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ دولت ونصرت ان کے گھر کی باندی ہو جاتی ہے اور ہر سال جنوری کے آخری عشرے میں ان کا نام کتھک، بھرت ناٹیم، اوڈیسی، کچی پوڑی اور کتھا کلی کے ماہرین اور طبلہ نوازوں کے ساتھ نمایاں طور پر معہ تصویر اخبارات میں شائع ہوتا ہے۔ دروغ برگردنِ راوی سنا ہے اب مافیائی طاقتیں بڑے انعامات اور ایوارڈز کے معاملات میں بھی حکومتوں اور ارباب اقتدار سے خاصا تعاون فرمانے لگی ہیں جس کے سبب اب بہت سے معقول افراد بھی ایوارڈز اور اعزازات کی فہرست میں جگہ پانے لگے ہیں۔

ناول ''مکان''، شعری مجموعہ ''درندہ'' اور اب افسانوی مجموعہ ''مافیا'' کے خالق جناب پیغام آفاقی پولیس افسر بھی ہیں، ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی۔ اس کے باوجود وہ کبھی حیرت انگیز طور پر اپنے ہی الفاظ میں ''مافیا کے زیراثر سماج میں انسان کے غیرانسانی رویوں کی نشان دہی'' کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی ''مافیا کے زیر اثر دہشت کے ماحول میں پلنے والے سماج کے کرداروں میں بڑھی ہوئی خودکلامی'' کا ذکر کرتے کرتے خود بھی خودکلامی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

یوں تو جناب پیغام آفاقی کے افسانوی مجموعے ''مافیا'' کے کئی حصے دلچسپ بھی ہیں، مگر مجموعہ کا سب سے زیادہ دل پذیر حصہ اس کا پیش لفظ بعنوان ''میں اور مافیا کی

جہات'' ہے۔ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ بڑے ادیب کتاب لکھنے میں جتنی محنت کرتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ مشقت وہ ''پیش لفظ'' کی تخلیق میں کرتے ہیں تاکہ فلیپ نگاروں نے مصنف کی تعریف وتوصیف میں خوفِ فسادِ خلق کی بنا پر جو ایک آنچ کی کسر چھوڑ دی ہے، وہ پوری ہو جائے۔ بعض مصنف تو اپنی کتاب کا پیش لفظ لکھتے وقت عبدالرحمٰن بجنوری کی کتاب ''محاسن کلام غالبؔ'' سامنے رکھ لیتے ہیں۔ اس قبیل کے پیش لفظ کا فائدہ مصنف سے زیادہ قاری کو پہنچتا ہے کیونکہ اسے پڑھ لینے کے بعد کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ لیکن ''مافیا'' کے پیش لفظ بعنوان ''میں اور مافیا کی جہات'' کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد ''مافیا'' کے علاوہ ناول ''مکان'' پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ پیش لفظ ایک ایسا مقدمہ معلوم ہوتا ہے جس کے وکیل، گواہ اور منصف، تینوں ہی خود مصنف ہیں۔ ملزموں کے کٹہرے میں البتہ انہوں نے بیک وقت انکسار اور اشتعال سے کام لیتے ہوئے نقادانِ ادب کو کچھ اس طرح کھڑا کیا ہے کہ کٹہرا اور انصاف، دونوں ہی ملزموں کے سامنے چھوٹے دکھائی دینے لگتے ہیں اور مصنف، مافیا اور مکان، تینوں کی عظمتیں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ اس مقدمے میں فاضل مصنف نے جدت طرازی سے کام لیتے ہوئے یہ دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے کہ حالیہ تصنیف کی خوبیوں کا بیان کرنے کی بجائے اپنی پہلی تصنیف ''مکان'' کی رفعتوں کو اپنا موضوع بنایا جائے کیونکہ وہ مانتے ہیں کہ ہمارا قاری، نقاد سے زیادہ ذہین ہے۔ اگر قاری کو یہ سمجھا دیا جائے کہ وہ جس مصنف کی کتاب کو بے توجہی اور قدرے بے ادبی کے ساتھ الٹ پلٹ رہا ہے، وہ ایک ایسے عظیم فنکار کا کارنامہ ہے جو پہلے ہی صرف اردو زبان نہیں، دنیا کی تمام زبانوں کے ادب کے مقابلے میں دنیا کے بہترین ناول کی تخلیق کر چکا ہے تو وہ فوراً سنبھل جائے گا اور انتہائی ادب واحترام کے ساتھ کتاب کے مطالعے میں مشغول ہو جائے گا۔ ہماری اس بات کو ہجو ملیح نہ سمجھا جائے، اس لیے کہ مندرجہ بالا توصیفی کلمات ہمارے نہیں، بلکہ خود ''مافیا'' اور ''مکان'' کے خالق جناب پیغام آفاقی کے ہیں۔ انہوں نے اپنے پیش لفظ میں خود اپنے الفاظ میں ''اردو کے ذہین قارئین'' کو مندرجہ ذیل چار نکات سے روشناس

کرایا ہے۔ واضح رہے کہ یہ چار نکات پیش لفظ کے اقتباسات ہیں......

(۱) ناول ''مکان'' اپنے فلسفۂ حیات اور تکنیک کے اعتبار سے اس قدر اوریجنل ہے کہ اردو افسانوی ادب میں تو کیا، عالمی ادب میں اس کی کسی ناول سے مماثلت نہیں ہے۔

(۲) اردو میں آج تک ''مکان'' ایسا ناول نہیں لکھا گیا جس میں ناول نگار نے ایک مفکر ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے عہدِ رواں کی زندگی کو مجموعی طور پر اپنے نقطۂ نظر سے دیکھا ہو اور اس بصیرت سے ایک با معنی فلسفۂ حیات مرتب کیا ہو۔

(۳) پہلی بار ''مکان'' میں انسان کی تخلیقی قوت کو کسی فکشن میں مادی اور دنیاوی قوتوں کے مدِ مقابل ایک حقیقی اور ثابت ہونے والی قوت کے طور پر لا کر کھڑا کیا گیا۔ اس سے قبل تخلیقی فکر کا کسی بھی عالمی ادب پارے میں ایسا استعمال نہیں ہوا تھا۔

(۴) آج کی دہشت گردی سے گھبرائی ہوئی دنیا اور اس سے نبرد آزما ہونے والے عالمی سیاست کے رہنماؤں کے لیے ''مکان'' ایک مینارۂ نور ہے۔

دراصل فاضل مصنف نے مندرجۂ بالا فرمودات سے اردو کے نقادوں کو بین السطور میں بہت کچھ سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اگر ہمارا خیال درست ہے تو یہ سراسر مصنف کا انکسار ہے، ورنہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ وہ نقادوں سے اس ناانصافی کی شکایت کرنے کی بجائے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ، بکر (Booker) پرائز اور نوبل پرائز کمیٹی کے عہدہ داران سے گلہ کرتے کہ انہیں اس عظیم کارنامے کی اطلاع کیوں نہیں ملی؟

بہر حال، جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، فاضل مصنف نے ان فرمودات کا مخاطب، ازراہِ انکسار یا انتشار، اردو کے ذہین قارئین کو بنایا ہے۔ انہیں پڑھ کر کسی مفکر کے اس قول پر دل فوراً ایمان لے آتا ہے کہ بے حد ذہین افراد کافی بیوقوف ہوتے ہیں اور انہیں سمجھداری کی باتیں بھی سمجھانی پڑتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ تمام باتیں مصنف نے اتنے یقین اور اتنے خلوص کے ساتھ لکھی ہیں کہ وہ قارئین جو بے مکانی کے مزے لوٹ رہے ہیں اور جنہوں نے صرف مکان کی شہرت سنی ہے یا ''مافیا'' کے پیش لفظ میں پڑھی ہے، وہ بھی ان سے فوری طور پر متفق ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم ایسے اوسط درجے کے

قاری کے لیے یہ سمجھنا دشوار ہے کہ آخر مکان جیسے اہم ترین ناول کے مصنف کو چند نقادوں کے رویے سے بددل ہو کر اپنی تخلیق کی خوبیاں گنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی جبکہ وہ یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ والدین جب اپنے بچے کی تعریفیں کرتے ہیں تو لوگ تائید میں سر تو ضرور ہلاتے ہیں مگر دل ہی دل میں مسکراتے بھی رہتے ہیں۔

یہاں ایک اور سوال دل اور جاں دونوں مقامات سے اُٹھتا ہے کہ کیا شاعر وادیب کو انگریزی محاورے کے مطابق اپنے Judgement میں خود بیٹھنے کی اجازت ہونی چاہیے؟ اور اگر ہاں تو اس کے کیا خوش گوار نتائج برآمد ہوں گے اور کیا اس سے ایک نئی قسم کے ادبی مافیا کے پروان چڑھنے کے امکانات روشن نہیں ہوں گے؟ کیا شاعر وادیب کو نقادوں کے رویے سے مایوس اور مشتعل ہونے کی ضرورت ہے یا مرزا غالب کی طرح......

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

کو شعار بنانا چاہئے اور فیصلہ آنے والی نسلوں پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چونکہ ہمارے ممدوح آنے والی نسلوں کے ادبی ذوق سے بھی مایوس ہیں۔ اس لیے انہوں نے آئندہ نسلوں کے فرائض بھی خود انجام دے دیئے ہیں۔ اپنے متقدمین کی تقلید کی روایت سے تو سبھی واقف ہیں لیکن وہ نسل جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی ہے، اُسے فرائض کے بوجھ سے سبکدوش کر دینا بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔

آج تبصرہ نگاری کا فن اس اونچائی پر پہنچ چکا ہے کہ کتاب پڑھ کر تبصرہ لکھنے کو تبصرہ نگار کی کم علمی سے تعبیر کیا جانے لگا ہے۔ حیرت انگیز طور پر کتاب پڑھے بغیر لکھے گئے تبصروں سے متاثر ہو کر جب عام قاری کتاب پڑھتا ہے تو اسے تبصرے کا ایک ایک حرف صحیح معلوم ہوتا ہے اور وہ مصنف سے زیادہ تبصرہ نگار کا شکر گزار ہوتا ہے جس نے کتاب فہمی کی دشوار راہوں میں اپنی علمیت کے کئی چراغ روشن کر دیئے ہیں۔ لیکن جناب پیغام آفاقی کا قول ہے کہ......

"میں ادب میں جرم کی بات کرتا ہوں تو وہ قوانین کے علاوہ فلسفوں، نظریات اور عقیدوں میں موجود غیر انسانی رویّوں کو بھی دسترس میں لیتا ہے۔"

اب آپ ہی بتائیے جب ایک مافیا شکن پولیس افسر اور نقادوں کے قلعے پر ضرب لگانے والا ادیب سامنے موجود ہو تو آپ کتاب کو پھل کی طرح سونگھ کر اس کی تلخیوں کا اندازہ کرنے کی ہمت کیسے کر سکتے ہیں؟ بہر حال وقت اور جگہ کی کمی اور افسانوں کی اثر انگیزی کی شدت کی زیادتی کے سبب صرف چند افسانوں کے تعلق سے ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

کسی بھی افسانوی مجموعے کو مزاح نگار کے زاویے سے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آخری افسانے کو سب سے پہلے پڑھا جائے تا کہ افسانہ نگار کی کمزوریوں پر آسانی سے گرفت کی جا سکے لیکن جس طرح کثیر العیال خاندان کی آخری اولاد کبھی کبھی بے حد ذہین ہوتی ہے، اسی طرح ''مافیا'' کا آخری افسانہ ''بوڑھا ملازم'' حسن اتفاق یا تدبیر مصنف سے مجموعے کا سب سے گوارا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ اپنے انوکھے موضوع اور (بقول مصنف) نئے ٹریٹمینٹ (Treatment) کے سبب متاثر کرتا ہے اور دل سے اک ہوک سی اُٹھتی ہے کہ ہمارے اپنے قلم سے ایسی کوئی تخلیق چاہے نہ نکلے مگر خود مصنف نے ایسے کچھ اور افسانوں کی تخلیق کی ہوتی تو ''مافیا'' بھی ''مکان'' کے معیار کے آس پاس ہوتی۔ اس علامتی افسانے میں تمثیلی انداز میں رِنگ ماسٹر کے اشارے پر ناچنے والے شیر کی کہانی بیان کی گئی ہے جو ایک دن (بقول مصنف) نئی روشنی سے منور ہو کر رِنگ ماسٹر پر حملہ کر دیتا ہے اور منٹوں میں اس کا کام تمام کر دیتا ہے۔ ہمیں اس افسانے میں صرف ایک قباحت نظر آئی کہ موجودہ سرکس کے رِنگ ماسٹروں کو یہ علم ہو جائے کہ پیغام آفاقی نے انہیں مافیا کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے، تو وہ احتجاجاً رِنگ ماسٹری کا کام چھوڑ کر پولیس کی ملازمت کرنے کو ترجیح دینے لگیں گے۔

اب ہم صراط مستقیم پر لوٹتے ہوئے کتاب کے پہلے افسانے ''بھوکمپ اور جوالا مکھی'' کی بات کرتے ہیں۔ یہ انشائیہ کے انداز میں لکھا ہوا علامتی افسانہ ہے جس میں ہر قدم پہ زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود یا اس کے باوصف ہم افسانے کو ایک ہی نشست میں ختم کر کے اطمینان کی سانس لیتے ہیں۔ جب افسانے کی

زمین سے جوالامکھی پھٹ پڑتا ہے اور انسانوں کے غیر انسانی رویوں اور بدکاریوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بھوکمپ کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ افسانہ پڑھ کر سلام بن رزاق کا افسانہ ''ندی'' یاد آجاتا ہے لیکن اس توارد میں مصنف کا وسیع تر ویژن (Vision) شامل ہے جس کی داد ایک عام قاری نہیں دے سکتا ہے۔

''مافیا'' کی ایک اور اہم کہانی ''لوہے کا جانور'' ہے جس کی ابتداء میں مصنف نے اس کا تعارف یوں کرایا ہے کہ یہ بے رحم ترقیات کی کہانی ہے۔ معاف کیجئے، ہم یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ ہر افسانے کی ابتداء میں مصنف نے اپنے ''ذہین قارئین'' کی آسانی کی خاطر افسانے کا مافی الضمیر چند سطروں میں بیان کیا ہے جو ٹیلی ویژن پر پیش کئے جانے والے اشتہار کا مزہ دیتا ہے، اور قاری کو یہ سہولت بھی بہم پہنچاتا ہے کہ وہ چاہے تو افسانہ پڑھے ورنہ اسے اپنے سے زیادہ ذہین قاری کے لیے چھوڑ کر آگے بڑھ جائے۔ بہرحال، ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ ''لوہے کا جانور'' میں یہ بتایا گیا ہے کہ گاؤں میں ٹریکٹر کے آجانے سے ہلوں پر جو گزرتی ہے، سو گزرتی ہے، مگر غریب کسان کے اشک اس کی عاقبت نہیں سنوارتے لیکن نئی نسل کے بچے ٹریکٹر کا استقبال تالیاں بجا کر کرتے ہیں۔ اس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ افسانے کا سب سے پُراثر حصہ یہی ہے جہاں گاؤں کے بچے، ہل، کسان اور راوی، تینوں سے زیادہ ذہین معلوم ہوتے ہیں جو اس کمپیوٹر ایج میں کم از کم ٹریکٹر کی اہمیت سے واقف ہیں۔

ایک اور افسانہ بعنوان ''کیا کہہ رہے تھے'' کے اشتہاری نوٹ کے مطابق تاریخ کے بازار میں انسانوں کی خرید و فروخت کی کہانی ہے جس میں مرکزی کردار کی ملکیت ایک ایسے کھیت کا قصہ ہے جس کے سامنے تالاب کے گھاٹ کا نقشہ ڈھائی ہزار سال پہلے اس کے خاندان کے ایک بزرگ نے بنایا تھا۔ اس کھیت کے رجسٹری کے کاغذات اسے ۱۹۱۲ء میں ملے تھے، جہاں ۱۹۴۵ء میں تھکن سے چور ہو کر وہ سو گیا تھا اور دسمبر ۱۹۹۴ء کے آخری دنوں میں اجنبی آوازیں اسے نیند سے جگا کر اسے اس کھیت سے بے دخل کر دینا چاہتی ہیں۔ اسے شدید حیرت ہوتی ہے مگر جب وہ اپنے نوجوان بیٹے کو

۱۹۹۳ء میں ایک توانا اور شاداب کونپل کی صورت دیکھتا ہے تو اجنبی آوازوں سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی ہمت اس میں لوٹ آتی ہے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ مصنف نے یہ افسانہ مارچ ۱۹۹۳ء کے بم بلاسٹ سے پہلے لکھا تھا یا بعد میں، کیونکہ اکثر بڑے قلمکار اپنی تخلیق کو دس بارہ برس تک طاق پر رکھ دیتے ہیں اور پھر اس پر نظر ثانی کے بعد قاری کے حوالے کرتے ہیں۔ لیکن اس افسانے میں مصنف کے قلم کا کمال یہ ہے کہ اُس نے دو صفحے کے مختصر افسانے میں ڈھائی ہزار سال کے تجربات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے اور اس طرح مورخ اور صحافی، دونوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد مرزا غالب کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے......

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

شاید مرزا غالب آج زندہ ہوتے اور پیغام آفاقی انہیں اپنا یہ افسانہ پڑھانے میں کامیاب ہو جاتے تو مرزا یہی کہتے ...... ''پیغام میاں، تم میرا یہ شعر لے لو مگر یہ افسانہ مجھے دے دو۔'' اس طرح مرزا غالبؔ کی مقبولیت میں تو کوئی فرق نہیں آتا، مگر پیغام آفاقی کے شعری مجموعہ ''درندہ'' کی اہمیت کچھ اور ہو جاتی۔

چونکہ یہ کتاب اردو میں لکھی ہوئی ہے (یہ ہم نے احتیاطاً اس لیے لکھ دیا ہے کہ کتاب کے نام سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہو کہ یہ انگریزی میں ہے) اس لیے کمپیوٹر کمپوزنگ کی غلطیاں کہیں کہیں جلوہ افروز ہیں۔ زبان و بیان کی چند لغزشیں بھی دامن کھینچتی ہیں۔ مگر وہ کچھ اس انداز سے سرزد ہوئی ہیں کہ ان کا سہرا بھی کمپیوٹر آپریٹر کے سر باندھا جا سکتا ہے۔ اس سے قطع نظر کتاب ''مافیا'' یقیناً ایک منفرد افسانوی مجموعہ ہے جس کی اثر انگیزی سے مافیائی انجمنوں، اکادمیوں اور ایوانوں کے علاوہ قاری کے ذہنی در و دیوار طویل عرصہ تک لرزتے رہیں گے اور بہت جلد وہ دن آئے گا جب اہل نظر ''چور کی داڑھی میں تنکا'' کہنے کی بجائے ''چور کی داڑھی میں مافیا'' کہنے کو ترجیح دینے لگیں گے۔

○○

یوسف ناظم: اپنے دشمنوں کی نظر میں

میرے ساتھ مشکل یہ ہے کہ میں جناب یوسف ناظم کو بہت قریب سے جانتا ہوں اور جو شخص بھی انہیں بے حد قریب سے جانتا ہو وہ ان پر اچھا مضمون یا اچھا خاکہ لکھ ہی نہیں سکتا۔ یوں بھی اچھے خاکہ نگار کی پہچان یہی ہے کہ وہ دور کے شناساؤں اور اجنبیوں پر ہی قلم اُٹھاتے ہیں اور ان سے جتنا فیض پہنچنے کی اُمید ہو، اتنا ہی قد آور بت تراش دیتے ہیں بلکہ ہم نے تو ایسے صاحب طرز خاکہ نگار دیکھے ہیں جو محض غائبانہ تعارف کی بنیاد پر قلم برداشتہ ایسا خاکہ کھینچ دیتے ہیں کہ صاحب اعزاز یا ممدوح کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مضحکہ خیز آئینے (Laughing Mirror) کے سامنے کھڑا ہو۔ خود جناب یوسف ناظم نے سلیمان اریب، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے خاکے لکھے ہیں، جن کو وہ قریب سے جانتے تھے۔ لیکن ان کا سب سے اچھا خاکہ وہ ہے جو انہوں نے باقر مہدی پر لکھا ہے، جنہیں یوسف ناظم تو کیا، خود باقر مہدی بھی اچھی طرح جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

یوسف ناظم کی شخصیت اور فن پر بہت کم لوگوں نے لکھا ہے لیکن ان کے فن، شخصیت، عادات واطوار، لباس اور اندازِ گفتگو پر زبانی تبصرے ہر خاص وعام محفل میں ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ان زبانی تبصروں کو یکجا کر دیا جائے تو خاصی دبلی پتلی اور منفرد مزاحیہ کتاب تیار ہو سکتی ہے جس کا عنوان ہوگا...... ''یوسف ناظم: اپنے دشمنوں کی نظر میں'' ان تبصروں میں سب سے اہم خراج عقیدت باقر مہدی نے پیش کیا ہے۔

انہوں نے یوسف ناظم کی کتاب ''کیف وکم'' کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ اس میں کیف بھی کم ہے اور کم بھی کم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تاریخی جملہ ان کے فن پر دراصل ایک بے حد مستند رائے ہے اس لیے کہ باقر مہدی جس صفائی اور سفاکی سے تبصرے کرتے ہیں، اس لحاظ سے اس جملے کو تعریف کا پل باندھنے کے مترادف سمجھا جانا چاہئے ورنہ وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ کیف وکم میں کیف بھی موجود نہیں ہے اور کم بھی غیر حاضر ہے۔ ان کا بس چلتا تو شاید وہ یہ بھی کہہ دیتے کہ...... ''کون یوسف ناظم؟'' اور یہ سن کر کسی کو حیرت بھی نہیں ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ باقر مہدی نے ایک نجی گفتگو کے دوران یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر یوسف ناظم بمبئی کے روزناموں میں کالم لکھنا بند کر دیں تو وہ (باقر مہدی) انہیں اس کا معاوضہ دینے کو تیار ہیں۔ اب جناب یوسف ناظم کے زود رنج ہونے کا عالم ملاحظہ فرمائیے کہ یہ جملہ سننے کے چند برسوں بعد انہوں نے سچ مچ ممبئی کے روزناموں میں کالم لکھنا بند کر دیا مگر اس وقت تک باقر مہدی اپنا وعدہ بھول چکے تھے۔ میرے خیال میں جس مزاح نگار کا کالم باقر مہدی کو اتنا ڈسٹرب کر سکتا ہے، وہ یقیناً ایک اہم اور بڑا مزاح نگار ہے۔

دراصل یوسف ناظم دشمن بنانے کے ہنر میں نہ صرف یکتا ہیں بلکہ یہ ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بایاں ہاتھ انہوں نے کھیلنے کے لیے ہی وقف کر رکھا ہے۔ اس لیے کہ ان کے دائیں ہاتھ میں ہمیشہ قلم رہتا ہے۔ وہ اپنی ہر تحریر اور تقریر سے کم از کم ایک دشمن بآسانی پیدا کر لیتے ہیں اور اس میں کبھی فیملی پلاننگ پر عمل نہیں کرتے۔ کبھی کبھی تو ایک مضمون کے بلّے میں پوری کی پوری جماعت یا قوم کو اپنا دشمن بنا لیتے ہیں۔ اردو ادب میں افسانہ نگاروں کی تعداد اور اہمیت کو جانتے ہوئے بھی انہوں نے لکھ دیا کہ:

> ''افسانہ نگار پر دنیا کی کوئی پابندی نہیں۔ یہ وہ شخص ہے جو سمجھتا ہے کہ یسوع مسیح کو صلیب پر اسی لیے چڑھایا گیا تھا کہ بعد میں افسانہ نگار دنیا میں آئیں اور جو چاہیں، لکھیں۔''

ظاہر ہے کہ ان کے اس خطرناک مضمون بعنوان ''اتنی سی بات'' نے اتنے ڈھیر

سارے دشمن پیدا کر دیئے۔ پھر شاعروں کو نشانہ بنایا تو بے محابا لکھ دیا کہ:

''شاعری میں ایک استاد کے قد و قامت کی پیمائش ان شاگردوں کی تعداد کے حساب سے کی جاتی ہے جو استاد کے زیرِ استعمال رہتے ہیں۔''

استادوں کو اپنا دشمن بنا چکے تو مبتدیوں کو اس طرح شکار کیا کہ......

''شاعری کا فن سیکھنے کے لیے کسی انسٹی ٹیوٹ بھی جانا نہیں پڑتا۔ دو چار مشاعرے سن لینے کے بعد آدمی شاعر بن سکتا ہے۔''

اور تو اور، مرزا غالبؔ کو بھی انہوں نے نہیں بخشا اور ان سے دشمنی مول لینے کی خاطر یکے بعد دیگرے انہوں نے غالب پر آٹھ مضامین لکھ دیے۔ حالانکہ ان کا ایک مضمون ہی جگر کے پار ہونے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ غالبؔ جہاں بھی ہوں، ان مضامین کو پڑھ کر مسکراتے رہتے ہوں گے۔ ادھر یوسف ناظم نے قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک مرزا کی تیوریاں نہیں چڑھ جاتیں وہ ان پر خامہ فرسائی کرتے رہیں گے۔

افسانہ نگاروں اور شاعروں کے علاوہ جس ادبی مخلوق کو یوسف ناظم نے ہدفِ تحریر بنایا ہے وہ نقاد ہیں۔ نقاد یوں بھی کسی بے فیض ادیب یا شاعر کے دوست نہیں ہوتے لیکن یوسف ناظم کا یہ تاریخی جملہ تو انہیں جانی دشمن بنانے کے لیے کافی ہے......

''نقادوں کو یوں بھی قدرت کی طرف سے کھلی اجازت ہے کہ وہ جہاں چاہیں، پیدا ہو جائیں۔''

لیکن حیرت انگیز طور پر میں نے ان کے ہر دشمن کو ان کی کسی نہ کسی خوبی کا اعتراف کرتے ضرور پایا ہے۔ میرا خیال ہے اس میں بھی یوسف ناظم کے حسنِ انتخاب کا بڑا دخل ہے کہ وہ کسی ایرے غیرے کو دشمن بنانا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس کے لیے وہ ہمیشہ ایسے شخص کا انتخاب کرتے ہیں جو کم از کم باظرف ہو۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے دشمنوں کے دل کے میل کو اپنی پُرلطف گفتگو سے دھو ڈالنے کا فن بھی خوب جانتے ہیں۔ یہ ان کے دوست بن جانے والے دشمنوں ہی کا خیال ہے کہ اگر یوسف ناظم ملک

کے وزیر خارجہ ہوتے تو اب تک سارے پڑوسی ممالک ہمارے دوست بن گئے ہوتے۔

خود میں نے کراچی میں طنز ومزاح کانفرنس سے پہلے اور بعد میں کئی دنوں تک یوسف ناظم کو ہمیشہ اپنے مداحوں کے جمگھٹے ہی میں دیکھا۔ پہلے اس لیے کہ وہ مداحوں کے نرغے سے نکل کر مضمون نہ سنا پائیں اور بعد میں اس لیے کہ وہ اپنی قہقہہ بار گفتگو سے انہیں دوبارہ مالا مال کر دیں۔

یہ یوسف ناظم کے دشمنوں ہی کی اُڑائی ہوئی ہے کہ ان کی گفتگو سے جتنے قہقہے پیدا ہوتے ہیں وہ ان کی تحریر میں محض زیرلب تبسم بن کر رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کامیاب طنزومزاح نگار کی پہچان ہی یہی ہے کہ اسے پڑھ کر زیرلب تبسم پیدا ہو اور قاری سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ مزاح کے درپردہ کتنی گہری چوٹ کی گئی ہے یا پہنچائی گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ ہنسنا جتنا آسان ہے، ہنسانا اُتنا ہی مشکل ہے۔ لیکن یوسف ناظم کا معالہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ آپ ان کے پاس کسی بھی موڈ میں چلے جایئے اور کیسی ہی غمناک اور دردانگیز خبر انہیں سنایئے، وہ آپ کی بات میں کوئی نہ کوئی مزاح کا پہلو نکال کر ایسا جملہ چست کر دیں گے کہ آپ بے اختیار مسکرا دیں گے۔ جب کہ خود موصوف بڑی مشکل ہی سے ہنستے ہیں۔ اپنی عجیب وغریب باتوں پر لوگوں کو قہقہے لگاتے دیکھ کر چہرے پر معصومیت اور مسکینی لئے، نظریں جھکائے بیٹھے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی البتہ انہیں زور سے ہنسنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے تو وہ اپنے قہقہے کو پوری طاقت سے دبا دیتے ہیں۔ اس کوشش میں ان کے منہ سے ایسی آوازیں نکلتی ہیں جیسے پانی کے پائپ میں موجود سوراخ میں سے رہ رہ کر پورے دباؤ کے ساتھ پانی باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

معمر نوجوانوں کی طرح یوسف ناظم کو بھی علی الصبح چہل قدمی کی عادت ہے۔ راستہ میں انہیں جتنے شناسا مردوزن، چرند پرند، یہاں تک کہ پیڑ پودے اور پتھر بھی نظر آئیں گے، یہ انہیں انتہائی سنجیدگی بلکہ رنجیدگی کے ساتھ کوئی نہ کوئی فقرہ عنایت کر دیں گے، وہ ہنستا رہ جائے گا اور یہ نکلتے چلے جائیں گے۔ شناسا کلیوں اور پھولوں کے لیے وہ نثر میں گفتگو نہیں کرتے بلکہ رباعی کے صرف دو مصرعوں پر اکتفا کرتے ہیں......

غنچے تری زندگی پہ دل دہلتا ہے
بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے

......اور ان کا مخاطب غنچہ یہ سن کر کھل کھلا اُٹھتا ہے۔ ان کے سامنے کسی غنچے کی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ ان سے جواباً کہے کہ بابا، چمن میں یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے۔

یوسف ناظم پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ بے تحاشا لکھتے ہیں اور لکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ کوئی بھی اخبار، کسی بھی رسالے کو اُٹھایئے اس میں ان کا مضمون ضرور ملے گا۔ یہاں تک کہ گمنام جریدوں میں بھی ان کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ ہمیں یہ سن کر بہت حیرت ہوتی ہے کہ جس قلمکار نے پچاس سالہ ادبی سفر میں صرف سولہ کتابیں لکھی ہوں، اس پر زود نویسی کا الزام کیسے لگایا جا سکتا ہے۔ ہم نے تو ایسے ادیب بھی دیکھے ہیں جن کی عمر اتنی نہیں ہوتی جتنی ان کی کتابوں کی تعداد ہوتی ہے۔ ہر رسالہ میں تخلیق شائع ہونے کا سبب یہ ہے کہ موصوف جتنے مضامین لکھتے ہیں، اتفاق سے اتنے ہی رسائل وجرائد بھی شائع ہوتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اردو میں اتنے کم رسائل کیوں نکلتے ہیں؟

یوسف ناظم کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ہر کسی کی کتاب پر تبصرہ پیش لفظ یا مقدمہ لکھ دیتے ہیں اور اس میں اچھے، بُرے اور زیادہ بُرے کی تخصیص نہیں کرتے اور کبھی کبھی تو وہ ایسی کتاب پر بھی مقدمہ لکھ دیتے ہیں جس کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مقدمہ کتاب سے کہیں بہتر تھا۔ ایسا کہنے والے یوسف ناظم کے لکھے ہوئے تبصرے یا پیش لفظ کو اگر بغور پڑھیں تو ان کی سمجھ میں آجائے گا کہ بین السطور میں انہوں نے خوبصورتی سے کتاب کے غیر معیاری ہونے کا صاف اشارہ کر دیا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی کتاب پر ان سے مقدمہ لکھوانے کی ہمت اسی لیے نہیں کی اور اسے بغیر مقدمے کے ہی شائع کرانے میں اپنی عافیت سمجھی۔

یوسف ناظم کے طرز تحریر کے متعلق مختلف دشمنوں کو مختلف غلط فہمیاں ہیں۔ کسی کو ان میں رشید احمد صدیقی کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو کوئی ان کی تحریر میں فکر تونسوی کا پرتو دیکھتا ہے۔ کسی کو ان کے ہاں پطرس بخاری کی شگفتگی ملتی ہے تو کوئی کہتا ہے مشتاق احمد

یوسفی کی طرح وہ کلاسیکی ادب سے اشارے اخذ کرتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری باتیں غلط ہیں، یوسف ناظم کا انداز نہ صرف نرالا ہے بلکہ ناقابل تقلید بھی ہے اور نوجوان مزاح نگاران کے نقش قلم پر چلنے کی جرأت نہیں کرتے۔

ادھر یوسف ناظم کے خلاف ایک بات اور اکثر سننے کو ملتی ہے کہ برسوں پہلے جب انہوں نے ''ایک پردیسی کا سفرنامۂ ہندوستان'' کے عنوان سے طویل مگر فرضی سفرنامہ لکھا تھا تو اس میں مزاح کی چاشنی تھی اور طنز کی گہرائی تھی جبکہ ادھر امریکہ کے سفر سے لوٹنے کے بعد انہوں نے جو سفرنامہ کا سلسلہ شروع کیا ہے اس میں وہ بات نہیں ہے۔ ہم ان کے دشمنوں سے مجبوراً اتفاق کرتے ہوئے اتنا ضرور کہنا چاہیں گے کہ دراصل پچھلی دو تین دہائیوں میں ہمیں فرضی سفرناموں کو پڑھنے اور مصنف کی رنگین خودستائیوں کو سہنے کی اتنی عادت ہوگئی ہے کہ اگر کوئی ادیب سچ مچ سفر کرنے کے بعد خودستائی کے بعد خودشناسی کو شعار بنا کر سیدھا سادا اور سچا سفرنامہ لکھنے لگتا ہے تو ہم جماہیاں لینے لگتے ہیں۔

جن لوگوں نے دل لگا کر یوسف ناظم کو پڑھا ہے اور اس کے بعد ان کی مخالفت شروع کی ہے، ان کا خیال ہے کہ یوسف ناظم کے ہاں قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی بلکہ محاورات آرائی بہت ہوتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ نئے شاعروں اور ادب کے سنجیدہ وغیر سنجیدہ طالب علموں کو اس سے استفادہ کرنا چاہیے بلکہ اگر کوئی طالب علم ہمت کرے تو اپنے استاد کی مدد کے بغیر ''محاوراتِ یوسف ناظم'' جیسی مفید اور بے ضرر کتاب بھی مرتب کرسکتا ہے۔ ''محاوراتِ داغ'' یوں بھی اب بازار میں نہیں ملتی۔

موصوف پر ایک سنگین الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ جب وہ مارکسٹوں کے درمیان ہوتے ہیں تو مارکسسٹ کہلاتے ہیں۔ کمیونسٹ انہیں اپنا ہمنوا سمجھتے ہیں، مسلمانوں کے ساتھ ہوتے ہیں تو ان سے زیادہ بڑا مذہبی مسلمان کوئی اور نظر نہیں آتا، ترقی پسندوں میں ترقی پسند اور جدیدیوں میں جدیدیت کے علم بردار معلوم ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کچھ لوگ ہمہ جہت ہوتے ہیں اور بیک وقت کئی

سمتوں میں سوچ سکتے ہیں۔ دوسری وجہ غالباً یہ ہے کہ یوسف ناظم کے اندر ایک معصوم سا بچہ آج بھی زندہ ہے جو ان کی انگلی پکڑ کر انہیں مختلف دکانوں کے شوکیسوں کے سامنے لے جاتا ہے۔ یہی وہ معصوم بچہ ہے جس نے یوسف ناظم کے اندر لذیذ، مرغن غذاؤں اور میٹھی چیزوں کے شوق کو زندہ رکھا ہے اور دشمن الزام تراشی کرتے ہیں کہ وہ کھانے پینے کے معاملے میں بچوں کو بھی مات کر دیتے ہیں۔

یوسف ناظم کی ظریفانہ طبیعت کی ایک شناخت عجلت ہے۔ وہ گفتگو جلدی جلدی کرتے ہیں، قدم اور قلم تیز تیز اُٹھاتے ہیں۔ مضمون سنانے میں ان کے پڑھنے کی رفتار قاری کے سمجھنے کی رفتار سے بھی تیز ہو جاتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے تو انہوں نے عجلت میں اس وقت مشاعرے کے اختتام کا اعلان کر دیا تھا جب کئی شاعروں کا کلام پیش ہونا باقی تھا۔ ہر پروگرام میں وہ وقت سے پہلے پہنچ کر میزبانوں کا استقبال کرتے ہیں۔ جس پروگرام کی صدارت کرنی ہو، وہاں تو اور بھی پہلے پہنچ جاتے ہیں۔ ہر ماہ شہر سے باہر کا سفر اختیار کرتے ہیں اور ٹرین کے مقررہ وقت سے دو گھنٹہ پہلے اسٹیشن پہنچ کر پلیٹ فارم کے طول وعرض کی بیسیوں مرتبہ پیمائش کرنے کے بعد ٹرین میں داخل ہونے والے پہلے نوجوان مسافر ہوتے ہیں۔ دہلی جانا ہو تو ہمیشہ راجدھانی ایکسپریس سے ہی سفر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ گاڑی یقینی طور پر دہلی پہنچاتی ہے۔ مگر راستہ بھر انہیں شکایت رہتی ہے کہ ٹرین کی رفتار اتنی کم کیوں ہے۔ دوستوں سے ناراض بھی بہت جلد ہوتے ہیں اور بہت جلد ہنسی ہنسی میں انہیں منا بھی لیتے ہیں۔ لیکن صرف ایک معاملہ ایسا ہے جس میں انہوں نے بحسن وخوبی بے حد تاخیر کر دی ہے۔ میں پچھلے تیس برسوں سے انہیں دیکھ رہا ہوں اور منتظر ہوں کہ وہ کب بوڑھے ہوں گے۔ لیکن میں انہیں جب بھی دیکھتا ہوں، اتنا ہی پھرتیلا، چاق وچوبند پاتا ہوں بلکہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی رفتار پہلے سے بھی کہیں زیادہ ہو گئی ہے اور ہم سب پیچھے رہ گئے ہیں۔ انہوں نے میڈیکل سائنس کے اس اصول کو صحیح ثابت کر دیا ہے کہ عجلت پسند لوگ جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں بشرطیکہ وہ مزاح نگار نہ ہوں۔

یوسف ناظم جب سے دفتری ذمہ داریوں سے ریٹائر ہوئے ہیں، اردو ادب کی خدمت کو انہوں نے اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ لوگ ان کے اوڑھنے بچھونے کو دیکھ کر ہی سمجھ جاتے ہیں کہ انہوں نے کتنی فقیرانہ طبیعت پائی ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ مضامین کے ذریعے ہونے والی خدمت کی خاطر خواہ مخالفت نہیں ہو رہی ہے تو وہ اس بے حسی سے کافی کبیدہ خاطر ہوئے اور انتقاماً انہوں نے پہلے زندہ دلان بمبئی اور پھر انجمن ترقی اردو اور مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادیمی کا بار سنبھال لیا اور جی جان سے خصوصی خدمات کا سلسلہ شروع کر دیا اور جب تک ان خدمات پر تنقیدیں ہوتی رہیں، وہ اپنی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے اور جیسے ہی انہوں نے محسوس کیا کہ اب لوگ تھک کر خاموش ہو گئے ہیں، وہ اپنے عہدے سے دستبردار ہو گئے۔ گو کہ انجمن ترقی اردو مہاراشٹر کے وہ آج بھی فعال صدر ہیں اور اس کے غیر فعال کردار کو کامیابی کے ساتھ قائم رکھے ہوئے ہیں۔

دشمنوں کا خیال ہے کہ یوسف ناظم کے ریٹائرمنٹ کا فائدہ اردو ادب کو یوں بھی پہنچا ہے کہ جب تک وہ سرکاری عہدے پر فائز رہے، سماجی اور ادبی ناہمواریوں پر ہلکے پھلکے انداز میں تیر چلاتے رہے۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد نہ صرف ان کی شخصی شگفتگی میں اضافہ ہو گیا بلکہ تحریر میں طنز کی کاٹ بھی نمایاں ہو گئی، سیاسی تبصرے بھی مضامین میں در آنے لگے اور ان کے سیاسی اور سماجی شعور کا صحیح پتہ بھی لوگوں کو ملا، اور اندازہ ہونے لگا کہ ان کے ہاں بائیں بازو کا رجحان بھی ہے۔ یہ الزامات جن لوگوں نے لگائے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ انہوں نے سرکاری ملازمت کا مزہ نہیں چکھا ہے۔ ورنہ انہیں پتہ لگتا کہ سرکاری افسر محنت اور لگن سے کام کرنے لگے یا کسی مزدور یا چپراسی کی طرف دیکھ کر مسکرا دے یا کسی سرکاری حکم نامے کو پڑھ کر ماتھے پر شکن بھی لے آئے تو اس کا فوراً تبادلہ ہو جاتا ہے۔

آج جناب یوسف ناظم کو ملازمت سے ریٹائر ہوئے ۲۹ ربرس ہو چکے ہیں اور وہ سرکاری کاغذات کے اعتبار سے (جن کا کوئی اعتبار نہیں) ۸۷ ربرس کے ہو چکے ہیں۔ مگر خاندانی کاغذات کی رو سے انہوں نے عمر طبعی کی محض ۸۴ ربہاریں دیکھی ہیں۔ بہت

سے لوگوں کا خیال ہے کہ یوسف ناظم نے جان بوجھ کر پیدائش کی دو تاریخوں کا اہتمام کر رکھا ہے تا کہ محقق ہمیشہ ان کی پیدائش کے غم میں مبتلا رہیں مگر یوسف ناظم ہیں کہ وہ ہمیشہ کی طرح گفتگو اور تحریر کی پھلجھڑیاں چھوڑ رہے ہیں اور اپنے مضامین، خاکوں، سفرنامے، ادب اطفال اور ادبی تراجم کی کم وبیش ۲۷ رکتابوں کی اشاعت کے بعد بھی سرگرم عمل ہیں۔ (اپنے شعری مجموعے کو ابھی تک انہوں نے ناشرین کی پہنچ سے دور ہی رکھا ہے) اور ان کے دوست دشمن سبھی ان کی تحریروں پر مسکرا رہے ہیں۔

OO
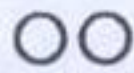
ایک ناسمجھ شاعرہ کا خاکہ

برصغیر ہند میں شاعرات کی موٹی موٹی دو قسمیں ہیں (ان میں موٹی اور دبلی، دونوں شاعرات شامل ہیں)۔ ایک مشاعرے کی شاعرات اور دوسری ادبی شاعرات۔ جہاں تک مشاعروں کی شاعرات کا تعلق ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو قدرے موزوں طبع ہیں اور گرتے پڑتے خود شعر کہہ لیتی ہیں۔ ادبی رسائل کے مدیر کبھی کبھی ان کی تصویر اور ٹیلی فون نمبر دیکھ کر ان کا کلام ضروری اصلاح کے بعد شائع بھی کر دیتے ہیں اور انہیں ٹیلی فون کرنا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن ایسی شاعرات کا چراغ مشاعروں میں زیادہ دیر اس لیے نہیں جلتا کہ وہاں دوسری قسم کی شاعرات بھی موجود رہتی ہیں جو اپنے جدید طرز کے لباس اور قدیم ہاؤ بھاؤ اور میک اپ اور روایتی عشووں اور غمزوں سے مشاعرہ بھی لوٹ لیتی ہیں اور مشاعرے کو تھوڑی دیر کے لیے سہی مجرے میں تبدیل بھی کر دیتی ہیں۔ مشاعروں کی یہ دوسری قسم کی شاعرات دراصل شاعری کا اسٹاک ایکس چینج ہوتی ہیں۔ یہ مشاعروں میں غزلیں فلمی ترنم اور غیر فلمی اداؤں کے ساتھ فروخت کرتی ہیں اور وہاں سے ہونے والی آمدنی کا معقول حصہ ان استادوں کے حوالے کر دیتی ہیں جن سے وہ غزلیں خریدتی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود مشاعروں کے منتظمین کو یہ شکایت رہتی ہے کہ آج کل اچھی یعنی خوب صورت شاعرات آسانی سے نہیں ملتیں اور مشاعرے کے ٹکٹ زیادہ نہیں بکتے۔ لیکن تازہ خبر یا افواہ یہ ہے کہ اب یہ قلت بھی دور ہونے والی ہے کہ سنا ہے مہاراشٹر میں بے روزگار

ہو جانے والی بہت ساری خواتین ملک کی دوسری ریاستوں میں شاعرات کا بھیس بدل کر ہجرت کر رہی ہیں۔

جہاں تک برصغیر ہند کی ادبی شاعرات کا تعلق ہے، ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو آزادی نسواں کی علمبردار ہوتی ہیں۔ ساغر و مینا کے بغیر شعر نہیں کہتیں۔ اپنے گھروں میں شاعروں اور ادیبوں کی غیر ادبی محفلیں سجاتی ہیں اور دوسرے دن مردوں کی بے وقوفیوں کی داستانیں مزے لے لے کر اپنی ہم مشرب سہیلیوں اور دوستوں کو ٹیلی فون پر سناتی ہیں تو کبھی ان بُری کتھاؤں کو کتابی صورت میں شائع بھی کر دیتی ہیں۔ ادبی شاعرات کی دوسری قسم ان کی ہوتی ہے جو عمر بھر اپنی تنہائی کو شراب کی بجائے کتاب میں ڈبوتی رہتی ہیں۔ قناعت پسند اتنی ہوتی ہیں کہ ایک آدھ محبوب سے آگے نہیں بڑھتیں اس لیے کہ انہیں عشق کی نہیں علم کی پیاس ہوتی ہے۔ یہ حقیقی یعنی Genuine شاعرات ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی منہ کا مزا بدلنے کی خاطر اچھے اور معیاری مشاعروں میں شرکت بھی کر لیتی ہیں لیکن ظاہری اور واضح وجوہات کی بنا پر مشاعرہ لوٹ نہیں پاتیں۔ ایسی شاعرات انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں بلکہ کبھی کبھی تو شاعرات کی گنتی ختم ہو جاتی ہے اور انگلیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ یہ اتنی ناسمجھ ہوتی ہیں کہ دولت اور شہرت جیسی متاع بے بہا پر عزت نفس جیسی فی زمانہ بے کار اور غیر مفید چیز کو ترجیح دیتی ہیں۔ رفیعہ شبنم عابدی ایک ایسی ہی ناسمجھ شاعرہ کا نام ہے۔

میں رفیعہ شبنم کو بچپن سے جانتا ہوں۔ میرا مطلب ہے اپنے بچپن سے۔ لیکن میری اور ان کی عمر میں محض دس گیارہ برس کا ہی فرق ہے اور اتنے کم عرصہ میں کسی کا بچپن ایک دم سے رخصت نہیں ہو جاتا۔ میں نے تو بلا قیدِ جنس ایسے بھی بزرگ دیکھے ہیں جو اپنی ذہنی عمر کے اعتبار سے کھلنڈرے بچوں کو بھی مات دیتے نظر آتے ہیں۔ خیر، تو میں کہہ رہا تھا کہ جب میں نے پہلی مرتبہ رفیعہ شبنم کو دیکھا تھا، اور دیکھتا ہی رہ گیا تھا تو ان کی عمر بمشکل اٹھارہ اُنیس برس کی تھی اور میں آٹھ سال کا تھا۔ جے۔ جے اسپتال کے قریب بی۔ آئی۔ ٹی بلاکس میں وہ رہتی تھیں اور ہمارا عارضی قیام بھی ان ہی بلاکس میں

تھا۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے وہ کسی بچے کی سال گرہ تھی جس میں وہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ میں ان کی طرف شاید غور سے دیکھتا بھی نہیں لیکن جب میں نے انہیں بولتے سنا، اور یہ تو یاد نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں، مگر اچانک ایسا لگا جیسے جلترنگ بج اُٹھا ہو۔ یہ ان کی آواز اور الفاظ کا جادو ہی تھا جس نے مجھے متوجہ کیا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چالیس برس پہلے بھی اچھی آواز کی مالک اور اچھی زبان بولنے والی خواتین کا اتنا ہی کال تھا جتنا کہ آج ہے۔ میں نے انہیں دیکھا اور یہ سوچا کہ یہ دبلی پتلی، گھنے بالوں اور خوب صورت بڑی بڑی آنکھوں والی سانولی، شرمیلی سی لڑکی کون ہے اور اس کی شخصیت اور اس کی آواز میں یہ کیسا طلسمی اثر ہے۔ اس سے میرا کیا رشتہ ہے اور یہ مجھے کیوں اتنی پرکشش معلوم ہوتی ہے۔ آخر میرے تقریباً معصوم دل نے فیصلہ کیا کہ ہو نہ ہو یہ میری بڑی بہن کا دوسرا روپ ہے۔ آج میں سوچتا ہوں کہ اس وقت میں نے ایسا کیوں سوچا تو جواب ملتا ہے کہ اس زمانے میں ایک آٹھ سال کے بچے کو اس سے زیادہ سوچنے کی نہ سمجھ تھی اور نہ اجازت۔ اس زمانے میں بچوں کی تربیت والدین ہی کیا کرتے تھے جن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ہاتھ میں اخلاقی اور مذہبی قدروں کی چھڑی ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں ابھی ٹیلی ویژن نے والدین کی جگہ نہیں لی تھی۔

رفیعہ شبنم کا تعلق منچر، مہاراشٹر کے ایک علمی، ادبی اور مذہبی خانوادے سے ہے لیکن ان کی پیدائش بمبئی جیسے ماڈرن شہر میں ہوئی۔ شادی سے پہلے وہ منچر کی نسبت سے رفیعہ شبنم منچری اور محلے کے منچلوں کی زبان سے رفیعہ شبنم منچلی بھی کہلاتی تھیں۔ نو بھائی بہنوں میں رفیعہ پیدائش کی ترتیب کے اعتبار سے چوتھے نمبر پر تھیں اور بقول خود ان کے گھر میں وہ ہمیشہ چوتھے درجے کی چیز ہی خیال کی گئیں جس میں ان کے سانولے رنگ کا بہت بڑا دخل تھا جس کی وجہ سے وہ احساس کمتری کا شکار رہیں۔ شاید انہیں کبھی اس بات کا پتہ ہی نہ چلا کہ بی۔ آئی۔ ٹی۔ بلاکس کے نوجوانوں میں ان کے سانولے رنگ روپ اور بڑی چمکدار سیاہ آنکھوں کا ذکر ان الفاظ میں ہوا کرتا تھا......

نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو

تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو

مجھے یقین ہے کہ یہ بات اگر رفیعہ شبنم کو تیس چالیس برس پہلے معلوم ہوگئی ہوتی تو ان کی شاعری کا موسم کچھ اور ہی ہوتا۔

رفیعہ شبنم کی تاریخ پیدائش ۱۱ر دسمبر ہے۔ جو لوگ ہر اتوار کی صبح اخبار میں سب سے پہلے ستاروں کی چال اور قسمت کا حال پڑھتے ہیں اور ہفتہ بھر پریشان رہتے ہیں، وہ یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ ۲۲ر نومبر سے ۲۱ر دسمبر کے درمیان پیدا ہونے والوں کا ستارہ یا بُرج قوس یعنی Sagittarius ہے۔ سر ونسٹن چرچل، جان ملٹن، مارک ٹوین، دلیپ کمار، راج کپور، والٹ ڈزنی، سردار جعفری اور رفیعہ شبنم عابدی بھی کی پیدائش اسی دوران ہوئی ہے۔ یوں علم نجوم کے حساب سے دیکھا جائے تو انسانوں اور ان کی قسمتوں کی صرف بارہ قسمیں ہوتی ہیں جو کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ دراصل قسمت صرف دو قسم کی ہوتی ہے، اچھی قسمت اور بُری قسمت۔ اور جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے، ہم نے ایسے بھی انسان دیکھے ہیں جو اپنی مختصر سی زندگی میں بارہ روپ بدلتے ہیں۔ خاکہ نگار ان کا خاکہ لکھنے کے چند برس بعد ہی اپنی غلطی پر شرمندہ ہو جاتا ہے اور نیا خاکہ لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ بہر حال کہا یہ جاتا ہے کہ جن لوگوں کا ستارہ قوس یعنی Sagittarius ہوتا ہے وہ بہت ہی توانا اور سرگرم ہوتے ہیں، ان میں تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے، وہ رجائیت پسند ہوتے ہیں، ذہین ہوتے ہیں، دیانتدار ہوتے ہیں اور آزادی کے متوالے ہوتے ہیں۔ یہ سب پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ Sagittarius لوگوں کی یہ تعریف رفیعہ شبنم کو دیکھ کر ہی لکھی گئی ہے۔ ان کی توانائی اور سرگرمی کا یہ حال ہے کہ وہ شاعری، تنقید، تحقیق، افسانہ نگاری، صحافت اور درس و تدریس کے محاذوں پر ایک ساتھ برسوں سے ڈٹی ہوئی ہیں۔ آپ کہیں گے، درس و تدریس سے وہ رٹائرڈ ہوگئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو شخص ایک بار استاد بن جاتا ہے وہ ہمیشہ استاد رہتا ہے، کبھی استادی سے نہیں جاتا۔ خود رفیعہ شبنم کے کئی استاد رٹائرمنٹ کے برسوں بعد بھی وہی سب کچھ کر رہے ہیں جو وہ اس

وقت کیا کرتے تھے جب وہ اردو استاد کی کرسی پر بیٹھا کرتے تھے!

جہاں تک تجسس کی بات ہے، وہ یقیناً ان میں ہے لیکن اسے وہ کمال خوب صورتی سے چھپانے کا فن جانتی ہیں۔

کہاں تھے رات گئے تک یہ راز کیوں پوچھیں
ابھی تو لوٹ کے آئے ہو، کیا خفا کرنا

کبھی تجاہل عارفانہ سے کام لیتی ہیں۔

اس سے کیا باعث تاخیر کی بابت پوچھوں
رات کے پچھلے پہر لوٹ کے گھر تو آیا

یا پھر یہ کہہ کر خود کو طفل تسلیاں دیتی ہیں۔

اسی لیے تو وہ آتا ہے دیر سے گھر کو
خدا کرے کہ لگے آگ اس کے دفتر کو

ازدواجی زندگی میں بیویوں کا یہ رویہ کتنا مفید ثابت ہوتا ہے، یہ رفیعہ شبنم سے بہتر اور کون جان سکتا ہے۔

رفیعہ شبنم ذہین اور تیز ہیں اس سے تو ان کے دشمنوں کو بھی انکار نہیں ہے لیکن جہاں تک رجائیت پسندی کا سوال ہے، یہ ہنوز ایک معمہ ہے۔ یوں تو ہر عورت بذات خود ایک معمہ ہوتی ہے جس کا صحیح حل خود اسے معلوم نہیں ہوتا ہے لیکن رفیعہ شبنم کی شخصیت اور شاعری دونوں کی تشکیل رجائیت اور قنوطیت، دونوں ہی کے خمیر سے ہوئی ہے۔ بلکہ ان کے ہاں کچھ کھو دینے کا احساس اور محرومی جتنی شدت سے نظر آتی ہے کامرانیاں اور سرشاریاں اتنی روشن نظر نہیں آتیں۔ یہ ہماری اپنی نظر کا دھوکا بھی ہو سکتا ہے لیکن کبھی کبھی تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی مسکراہٹوں کے پیچھے بھی نہ جانے کتنے آنسو چھپے ہوئے ہیں۔

تھوڑی خوشیاں، تھوڑے ارماں، تھوڑے سے غم رہتے ہیں
میں کیا جانوں دل کے اندر کتنے موسم رہتے ہیں

رفیعہ شبنم کی دیانتداری کے بارے میں کیا عرض کروں۔ انہیں زندگی میں بددیانتی کے بہت کم مواقع نصیب ہوئے لیکن جہاں بھی ملے وہ ان سے دامن بچا کر یوں نکل گئیں جیسے آجکل سیاستداں سچ بولنے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کی عادت نہ بگڑ جائے۔ رفیعہ شبنم کو بھی میں نے کبھی کبھی جھوٹ بولتے سنا ہے لیکن وہ بڑے بے ضرر قسم کے جھوٹ ہوا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے خلاف سازشیں کرنے والوں کا دعویٰ ہے کہ رفیعہ خود سازشی ہیں لیکن اس طرح کے الزامات سن کر رفیعہ شبنم کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں آئی اور ان کے منہ سے یہی نکلا......

میرے کردار کو کیا قتل کرے گی دنیا
میں جہاں بھی رہی، بیدار ضمیروں میں رہی

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا Sagittarians کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آزادی کے متوالے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے یہ سچ ہو لیکن رفیعہ شبنم کی مذہبی روایتیں انہیں لکشمن ریکھا پار نہیں کرنے دیتیں۔ وہ عورتوں کی لامحدود آزادی کے خلاف ہیں لیکن ان کے ہاں روایت سے بغاوت کا جذبہ اور مذہبی پابندیوں کی پاسداری، دونوں کی کشمکش صاف نظر آتی ہے۔ شاید اسی لیے وہ اپنی شاگرداؤں میں غیر معمولی طور پر مقبول ہیں۔ ان کی یہ کشمکش شعر بن کر یوں ڈھل جاتی ہے۔

شہر کے کوچہ و بازار میں کب جاتی ہے
میری آواز مرے گھر ہی میں دب جاتی ہے

رفیعہ شبنم نے ایک زمانے میں بہت بولڈ قسم کا شعر لکھا تھا

میں تو بزدل تھی ترے ساتھ نہ آنے پائی
تو جری تھا تو مجھے کس لیے اغوا نہ کیا

لیکن بعد میں اسے یوں تبدیل کر دیا

وہ تو بزدل تھی ترے ساتھ نہ آنے پائی
تو جری تھا تو اسے کس لیے اغوا نہ کیا

یہی کشمکش رفیعہ شبنم کی شخصیت اور شاعری دونوں ہی کی شناخت ہے اور اسی نے انہیں ابھی تک توانا اور تر و تازہ رکھا ہے۔

کہتے ہیں جو شخص جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے اتنے ہی زیادہ دشمن بھی ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے رفیعہ شبنم کے بھی، خدا کا شکر ہے، کافی دشمن اسی شہر میں موجود ہیں۔ ویسے دشمنوں کے سلسلے میں رفیعہ شبنم حضرت علیؓ کے اس قول پر سختی سے کار بند ہیں کہ ''دشمن سے انتقام لینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔'' رفیعہ شبنم کے دشمن سمجھدار بھی ہیں اور ناسمجھ بھی، عقلمند بھی ہیں اور بیوقوف بھی۔ ان میں سے کئی ایک ایسے بھی ہیں جن کے نام سے پہلے ڈاکٹر اور پروفیسر اور نام کے بعد ایم۔ اے (اردو) اور پی۔ ایچ۔ ڈی لکھا ملتا ہے۔ ایسے ہی ان کے ایک پڑھے لکھے دشمن نے مجھے ایک روز رات کے دس بجے فون کیا اور کہنے لگے...... ''آپ تو رفیعہ شبنم کی شاعری کے بڑے قائل ہیں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ ''آپ نے صحیح سنا ہے، لیکن آپ کو رات کے دس بجے اس کی تصدیق کرنے کی ضرورت کیسے پیش آگئی؟'' وہ ہماری بات ٹال کر کہنے لگے...... ''نہیں، آپ تو کہتے تھے کہ رفیعہ غیر ضروری بیباک شعر نہیں کہتی ہیں اور ان کے کسی شعر سے ذم کا پہلو برآمد نہیں ہوتا ہے۔'' اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہتے، ڈاکٹر صاحب نے مزید فرمایا...... ''اب دیکھیے رفیعہ شبنم کا یہ شعر......

ہم سمجھے تھے ٹھنڈا ہوگا

یہ نہ خبر تھی شعلہ ہوگا

کیا اس میں ذم کا پہلو نہیں ہے؟'' میں ان کی تحقیق کا قائل بھی ہوا اور حیران بھی۔ پھر بھی میں نے جواب دیا...... ''رات بہت ہو چکی ہے اس لیے ایسے اشعار پر بحث کرنا مناسب نہیں۔ ہم اس پر صبح بات کریں گے۔''

میں نے ٹیلی فون رکھنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ رفیعہ شبنم کا دوسرا شعری مجموعہ ''اگلی رُت کے آنے تک'' کھنگال دیا مگر یہ شریر شعر نہیں ملا۔ پہلا مجموعہ اتفاق سے کوئی صاحب دو برس پہلے مانگ کر لے گئے تھے اور لوٹانا بھول گئے تھے۔ صبح سویرے میں

مقامی لائبریری کے کھلتے ہی وہاں پہنچ گیا۔ جلدی جلدی ''موسم بھیگی آنکھوں کا'' نکالا اور ورق گردانی شروع کر دی۔ پھر صفحہ نمبر ۷ پر پہنچا تو پہلی ہی غزل کے مطلع پر میری نظریں ٹھہر گئیں۔ میں نے اطمینان کی سانس لی مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اعتراض کرنے والے ڈاکٹر صاحب نے شرارت کی تھی یا سچ مچ یہ ان کی علمیت کا ثبوت تھا۔ شعر یوں تھا......

ہم سمجھے تھے ٹھنڈا ہوگا، موسم بھیگی آنکھوں کا
یہ نہ خبر تھی شعلہ ہوگا، موسم بھیگی آنکھوں کا

رفیعہ شبنم کا کوئی تذکرہ، کوئی خاکہ عابدی صاحب کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ جن کی وہ نصف بہتر ہیں۔

سنا ہے نصف بہتر بھی کہا جاتا ہے بیگم کو
تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ شوہر ہے خراب آدھا

رفیعہ شبنم کے فلیٹ کے دروازے پر ان کے بچوں نے ایک تختی لگائی ہے جس پر انگریزی میں لکھا ہے کہ عابدی صاحب اس گھر کے ہیڈ ہیں اور رفیعہ شبنم ہارٹ یعنی دل ہیں۔ اب یہ ان کا خانگی معاملہ ہے اس لیے ہم صرف مسکرا دیں گے۔ رفیعہ شبنم کے افسانوں میں ان کا ہیرو علی گڑھ کا تعلیم یافتہ اور معاشیات کا گریجویٹ ہوا کرتا تھا۔ حسن اتفاق سے ہمارے عابدی صاحب میں بھی رفیعہ کے ہیرو کی یہ دونوں باتیں موجود ہیں یعنی انہوں نے علی گڑھ سے معاشیات میں گریجویشن کیا ہے اور اس طرح سے وہ تعلیمی صلاحیت کے اعتبار سے یقیناً رفیعہ شبنم کے آئیڈیل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قوس یعنی Sagittarius والے لوگوں کے رومانی تعلقات جیمنی Aries اور Leo سے تعلق رکھنے والوں سے بہت خوشگوار ہوتے ہیں۔ اب عابدی صاحب کی تاریخ پیدائش ۳۰؍جون ہے جس کا ستارہ یا برج کینسر ہے۔ اس کے باوجود یا اسی وجہ سے پچھلے ۳۸؍برسوں سے رفیعہ شبنم اور عابدی صاحب لڑتے جھگڑتے کم اور ہنستے کھیلتے زیادہ زندگی گزار رہے ہیں۔

○○

اُردو شاعری کا شنکر

یہ کسی مفکر کا نہیں، ہمارا اپنا قول ہے کہ اچھے آدمی اور اچھے پھل دونوں کی کسوٹی مٹھاس ہے۔ اچھے پھل کی پہچان غالبؔ کے الفاظ میں یہ ہے کہ میٹھا ہو اور بہت ہو۔ اچھے آدمی کی شناخت یہ ہے کہ بہت میٹھا نہ ہو ورنہ اس پر سیاسی لیڈر، تاجر، عاشق، یا عبدالاحد ساز ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ اچھے آدمیوں کی تعداد بھی سماج میں کم سے کم ہونی چاہئے، ورنہ زندگی بے مزہ اور دُنیا بے رونق ہو جائے گی۔ ممبئی کی ادبی اور تجارتی دُنیا کی رنگینیوں اور رونقوں کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ یہاں عبدالاحد سازؔ جیسے شریف اور مرنجاں مرنج انسان اور شاعر اور دوسروں کے فائدے اور اپنے نقصان کی فکر میں دُبلے ہونے والے تاجر چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے......

سودے میں غزل کے فائدہ؟ سازؔ
کیسا نقصان ہو گیا ہے

عبدالاحد سازؔ کی شخصیت اتنی ٹرانس پیرنٹ، پیچیدگیوں سے عاری اور آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہے کہ اس پر خاکہ لکھنا کسی مداری کی طرح تنے ہوئے رسے پر چلنے کے مترادف ہے، ذرا لغزش ہوئی اور آپ کے نیکیوں اور پرہیز گاریوں کے خارزار میں گرنے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ شاعر اور ادیب کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ وہ بڑے اطمینان سے معاشرے کی ناہمواریوں پر قلم چلاتے ہوئے ذاتی بُرائیوں اور خامیوں کی رنگین فضاؤں میں ہنستے کھیلتے زندگی گزار سکتا ہے مگر زہد وتقویٰ کے ماحول میں

اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ عبدالاحد سازؔ جب فوٹوگرافر کے اشارے پر مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ دُنیا بھر میں پھیلی ہوئی بُرائیوں اور ان کی اپنی ذات میں پنہاں نیکیوں کا کرب سمٹ کر ان کے ہونٹوں پر آگیا ہے۔ ان کی یہی وہ دردمندانہ اور دردناک مسکراہٹ ہے جو انہیں قرض داروں اور معشوقوں میں یکساں طور پر مقبول بنادیتی ہے۔

سروقد معشوقوں کو مات دیتا ہوا لانبا قد اور ان ہی معشوقوں کے حضور میں جھکے ہوئے کاندھے، ہیڈفون کی طرح احتیاط سے فٹ کئے گئے متناسب کان، جنہیں اب کرخت اور بدصورت آوازوں کو نظرانداز کرنے اور اپنے اندر جذب کرلینے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ سر اور داڑھی مونچھ کے بالوں میں حیرت انگیز تضاد جو اِن کی شعوری کوششوں کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی سر کے بال اِن کی نظموں کے مشکل الفاظ اور تراکیب کی طرح نسبتاً گھنے، سیاہ اور چمکدار اور داڑھی مونچھ کے بہت سے بال بے وفا دوستوں کی طرح غائب اور بقیہ بیشتر بال ان کے غم میں روتے روتے سفیدی کی طرف مائل، بے خود ساعتوں کی کہانیاں سناتے دلکش مردانہ ہونٹ، اپنے جائے مقام پر اتراتی ہوئی ستواں ناک جو کسی اور چہرے پر لگادی جائے تو لطیفہ بن جائے، خوش بختی، ذہانت اور گنجے پن کے آغاز کا اعلان کرتی ہوئی چوڑی پیشانی اور موٹی عینک کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی روشن آنکھیں جن میں زمین وآسمان کے مابین حیرتوں کے سلسلے بھی ہیں اور وہ سوزِ نہاں بھی ہے جو محبت کی شادی کرنے والے مردوں کی آنکھوں سے جھلکتا رہتا ہے۔

ہمارا اپنا ہی ایک اور قول ہے کہ ہر کامیاب شخص کے پیچھے ایک عورت اور ہر ناکام شخص کے پیچھے ایک بیوی ہوتی ہے۔ عبدالاحد سازؔ نے ہمارے اس قول کو غلط ثابت کر دکھایا ہے کہ ان کی بیگم ہر جگہ ان کے آگے آگے، ان کی رہنمائی کرتی نظر آتی ہیں حالانکہ اگر رہنمائی کا فریضہ عورت انجام دے تو وہ ''رہ زنی'' ہی کہلائے گا۔

عبدالاحد سازؔ کی شخصیت کی ایک اور خوبی یا خامی یہ ہے کہ انہوں نے اُسی اسکول میں تعلیم پائی ہے جس اسکول میں ہم کئی برسوں تک محض شرارتیں سیکھتے رہے۔ انہیں بھی

اسکول ہی میں جالبؔ مظاہری جیسے زبان و آرٹ کے استاد ملے جنہوں نے نہ صرف اپنے طلبہ کو اچھی زبان کے گر سکھائے، شعر و ادب کے ذوق کی آبیاری کی بلکہ وہ جمالیاتی ذوق بھی پیدا کیا جس کے بارے میں غالبؔ نے فرمایا تھا......

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

لیکن سازؔ کی رومانیت نے انہیں نکما بنانے کی بجائے موزونیِ طبع کی طرف مائل کر دیا اور انہوں نے بقول خود اُن کے یہ طے کر لیا کہ وہ کسی جمالیاتی آہنگ کے بغیر کسی موضوع کو اپنے شعری اظہار کا حصہ بننے نہیں دیں گے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب آتش جوان تھا اور سازؔ خود حسن و جمال کا پیکر ہوا کرتے تھے۔ اس لیے انہیں جمالیاتی آہنگ کے لیے کبھی مشقت نہیں کرنی پڑی اور وہ بڑی آسانی سے خوب صورت اور بامعنی اشعار کی تخلیق کرنے لگے۔

عبدالاحد سازؔ کی پیدائش اور پرورش ممبئی کے ایک مذہبی اور خوشحال گھرانے میں ہوئی لیکن انہوں نے کبھی عید میلادالنبی کے جلوس میں شریک ہو کر نعرے نہیں لگائے بلکہ ہمیشہ مذہب کی آفاقیت کے قائل رہے۔ اپنے والد مرحوم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے وہ شاعری، کاروبار اور ازدواجی زندگی کی پگڈنڈیوں سے بھرے پیچیدہ اور دوطرفہ راستے پر اندھیرے سے اجالے کا سفر طے کرتے رہے اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے کہ......

ازدواجی زندگی بھی اور تجارت بھی، ادب بھی

کتنا کارآمد ہے سب کچھ اور کیسا بے سبب بھی

آج عبدالاحد سازؔ اپنے شعری سفر کے دوسرے پڑاؤ تک پہنچ کر اپنی سانسیں درست کر رہے ہیں اور اگلے سفر کے لیے تازہ دم ہو رہے ہیں۔ ان کی پہلی شعری تصنیف ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کے بعد طبقاتی کشمکش، اقدار کی شکست و ریخت، صنعتی معاشرے میں انسان کی تنہائی، تیسری دُنیا کے مسائل، سیاسی جبر اور گلوبل کلچر کے جنگل میں پورے چودہ برس کا بن باس کاٹ کر اپنی دوسری شعری تصنیف تک پہنچے ہیں۔ ایک

عام انسان زندگی کے پہلے حصہ میں دُنیا میں شور مچانے کا لطف اُٹھاتا ہے، پھر سرگوشیوں بھری زندگی کے مزے لوٹتا ہے اور پھر آخرت کے خوف اور ناتوانی کے بوجھ سے خاموشی کو اپنا شعار بنالیتا ہے۔ عبدالاحد سازؔ نے اس سفر کو اُلٹا طے کیا ہے۔ پہلے ''خموشی بول اُٹھی ہے'' اور اب ''سرگوشیاں زمانوں کی''۔ شور انہیں کبھی پسند نہیں رہا اور جب شور مچانے کا زمانہ تھا تو وہ کتابوں اور کتابی چہروں کے مطالعہ میں غرق رہے اور اب جبکہ وہ اپنی عمر کی چھٹی دہائی میں ہیں، اپنی سرگوشیوں کو زمانے کی سرگوشیوں سے ہم آہنگ کرکے دل ہی دل میں مسکرا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ''شور'' ان کے تیسرے مجموعے کے نام کا حصہ ضرور ہوگا۔ انہوں نے اپنی نظم ''بے نشاں ہونے سے پہلے'' میں اس کی پیشین گوئی بھی کردی......

زندگی اک دور تک سنگیت تھی، اب شور ہے
ہاں مگر اس شور کے بکھراؤ میں
بے محابا صوت کے ٹکراؤ میں
شاید ابھی اندوختہ کچھ زیر و بم ہوں

عبدالاحد سازؔ کی طبیعت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے دلی مسرت حاصل کرتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ ہوتے ہیں تو انہیں خوب بولنے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور روحانی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ کبھی کبھی گفتگو میں شریک ہوکر اپنی موجودگی کا احساس البتہ دلا دیتے ہیں۔ جب بل دینے کا وقت آتا ہے تو سارے دوست انہیں موقع دے دیتے ہیں اور وہ خوشی خوشی اس موقع کو اپنا حق سمجھ کر بل ادا کردیتے ہیں۔ سازؔ مے نوشی کی نشستوں میں بھی شریک ہوتے ہیں مگر اس کا بل ادا کرنا غیر شرعی سمجھتے ہیں اور وہاں بھی بغیر شکر کی کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے یہ شعر گنگناتے رہتے ہیں......

تشنگی اپنا مقدر ہے، جز اک قطرۂ اشک
پاس کچھ بھی نہیں کیا بادہ و ساغر باندھوں

دوستوں کی مدد کرنے کے معاملے میں بھی سازؔ کا جواب نہیں۔ کوئی اسپتال میں

داخل ہے، اس کی عیادت یوں دائیں ہاتھ سے کرتے ہیں کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی۔ کسی کا آپریشن ہے تو مخیّر احباب اور اداروں سے رقم اکٹھا کر رہے ہیں، کسی کے گھر راشن بھیج رہے ہیں تو کسی کو یہ جان کر قرض دے رہے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد یہ قرض حسنہ بن جانے والا ہے۔ ایک زور میں ان کے گھر پہنچا تو ایک پوسٹ کارڈ ہاتھ میں لیے غمگین سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے اسے پڑھ رہے تھے۔ میں نے اصرار کیا تو پوسٹ کارڈ دے دیا۔ شکستہ خط میں لکھا تھا......

"آپ نے جو راشن میرے گھر بھیجا ہے اس کا بہت بہت شکریہ۔ مگر چاول اور گیہوں کی کوالٹی بہت ہی گھٹیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں مفلس ضرور ہوں مگر میرا امزاج شاہانہ ہے۔ براہ کرم آئندہ راشن بھیجتے وقت اس کا خیال رکھیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو کہنے لگے۔ "میں نے انہیں جو سامان بھیجا تھا، وہی ہم بھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اب میں نے بنئے کو مناسب ہدایت دے دی ہے۔"

عبدالاحد ساز کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے علاوہ کبھی کسی کو "نہیں!" نہیں کہتے۔ کتابوں کی اس دکان کے قریب سے بھی نہیں گزرتے جس کے بارے میں پتہ لگ جائے کہ وہاں "جب آپ کو نہیں کہنا ہو تو ہاں مت کہیے" نامی کتاب ملتی ہے۔ ہمیں البتہ وہ اپنے افراد خانہ میں ہی شمار کرتے ہیں۔ ہم نے ایک مرتبہ ان سے مذاقاً ایک بڑی رقم بطور قرض طلب کی تو خاموشی کے ایک طویل وقفہ کے بعد کہنے لگے...... "آپ نے سچ مچ دیر کر دی۔ کل ہی میں نے آپ کے اور اپنے ایک مشترکہ دوست کو اتنی ہی رقم قرض کے طور پر دی ہے۔ ان کا نام مت پوچھئے گا۔" ہم خاموش ہو گئے اور اس مذاق کو بھول گئے لیکن دوسرے دن صبح صبح ہماری بھابی یعنی مسز ساز کا فون آ گیا...... "فیضی بھائی! کیا واقعی آپ کو پیسوں کی ضرورت ہے؟" ہم نے فوراً کہا۔ "نہیں تو! یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟" کہنے لگیں...... "نہیں، کل ساز گھر آئے تو

بہت فکر مند تھے۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے۔ ''آج فیضی نے پہلی مرتبہ مجھ سے قرض مانگا اور ظاہر ایسا کر رہے تھے جیسے مذاق کر رہے ہوں لیکن ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ واقعی ضرورتمند ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ان کی مدد کیسے کروں۔'' پھر بیگم ساؔز نے ہم سے دردانہ لہجے میں دریافت کیا۔ ''فیضی بھائی! سچ بتایئے! آپ مذاق کر رہے تھے نا؟''

عبدالاحد ساؔز کی شخصیت میں کئی خامیاں اور بھی ہیں۔ وہ بے حد متین، منکسر المزاج اور صاف گو آدمی ہیں اور فی زمانہ یہ ساری خصوصیتیں خامیوں میں شمار ہوتی ہیں اور شرفا ان سے دور رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ عبدالاحد ساؔز کو غصہ جلد نہیں آتا لیکن جب آتا ہے تو اس کا اظہار وہ کبھی خاموشی تو کبھی دبے دبے احتجاج سے کرتے ہیں، جیسا کہ سعادت مند شوہروں کا شیوہ ہوتا ہے۔ کبھی اتفاقاً زیادہ غصہ یا اشتعال آجائے تو وہ کبھی نظم تو کبھی شعر کی صورت ڈھل جاتا ہے......

تم پھوٹ کے پھیلو گے مگر کوڑھ کی صورت
ہم زخم کی مانند تر و تازہ رہیں گے

ساؔز کی شخصیت کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ وہ سوائے فرقہ پرستی کے کسی اور سے نفرت نہیں کرتے جبکہ فی زمانہ ترقی کرنے کے لیے نفرت اور دشمنی سے بڑھ کر کوئی اور سیڑھی نہیں۔ ساؔز مذہبی بھی ہیں اور ادیب و شاعر کی حیثیت سے شناخت بھی بنا چکے ہیں۔ لیکن انہیں وفاداریاں بدلنے کا ہنر نہیں آتا ورنہ آج کل تو ہوا یہ چلی ہوئی ہے کہ مسجدوں کے امام اور مشاعروں کے شاعر دونوں اسی کوشش میں ہیں کہ کسی گلی میں زندگی کی شام ہونے سے پہلے وہ زندگی کے اُجالوں سے اپنے گھر بھر لینے کا سودا کرلیں۔ عبدالاحد ساز کی شاعری اور شخصیت کی محدودیت اور لامحدودیت یہ ہے کہ وہ باوجود خواہش کے فلمی شاعر نہیں بن سکتے اور ممکن ہے کہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ تک بھی ان کی رسائی نہ ہو پائے۔ مرحوم علی سردار جعفری اور عبدالاحد ساؔز میں یہ ایک قدر مشترک ہے!

ہندو دیومالا کے مطابق شنکر ہر قسم کے مادی سُکھ اور خواہشات سے دور رہنے والا

بیراگی دیوتا ہے جس نے سمندر منتھن کے دوران دنیا پر رحم کھا کر زہر ہلاہل پی لیا تھا لیکن شدید تکلیف کے سبب اس زہر کو گلے ہی میں روک لیا تھا۔ شنکر کی اس تکلیف کو راحت پہنچانے کے لیے ہلال کی شکل کا چاند سمندر سے نکل کر اس کے سر پر بیٹھ گیا تھا۔

کالی داس نے کمار سنبھو میں جو پنچ مہا کاویوں میں سے ایک ہے، لکھا ہے کہ شنکر ایسے شانت مہا ساگر کی طرح ہے جس میں کوئی لہر نہیں اُٹھتی، وہ برسات کے ایسے بادل کی طرح ہے جس میں اتنا پانی بھرا ہوتا ہے کہ محض پھونک مارنے سے سیلاب کی کیفیت طاری ہو سکتی ہے۔ وہ ایک ایسی جیوتی کی مانند ہے جو خلاؤں میں بغیر ہوا کی مدد کے، جل رہی ہے۔ میں جب بھی عبدالاحد سازؔ کی شخصیت کو مکمل طور سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں، مجھے اس میں ایک شنکر دکھائی دیتا ہے جس کے سر پر شاعری کا چاند بیٹھا مسکرا رہا ہے۔

○○

محقّق مصطفیٰ کمال کی شگوفہ کاریاں

ہم نے اپنی زندگی میں جب پہلے ڈاکٹر آف فلاسفی یعنی پی۔ ایچ۔ ڈی کو دیکھا تھا تو ہماری عمر صرف سولہ برس کی تھی۔ وہ ہمارے کالج کے اردو لیکچرر تھے اور اپنے نام سے پہلے پروفیسر کا لاحقہ ضرور لگاتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز نرالا تھا۔ وہ صرف طالبات سے سوالات کرتے تھے اور ان کے غلط جوابات کے سہارے پیریڈ ختم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ عہد قدیم کے ایک گمنام شاعر پر پی۔ ایچ۔ ڈی کر رکھی تھی جسے دنیا والوں کی نظروں سے اس طرح پوشیدہ رکھا تھا جس طرح خدا کے نیک بندے اپنے اچھے اعمال کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد نے ان کے غیر تحقیقی مقالے کو دوسری غیر ادبی کتابوں اور جاسوسی ناولوں کے ذخیرے کے ساتھ غالباً ان کی اپنی وصیت کے مطابق ردّی میں فروخت کر دیا گویا ان کی نیکیوں کو دریا میں ڈال دیا۔

ایک اور بزرگ پروفیسر، ڈاکٹر ہمیں آج بھی یاد ہیں جنہوں نے مشہور نقاد احتشام حسین سے یہ دریافت کرنے کے لیے کہ وہ کس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں، یہ پوچھا تھا...... ''احتشام صاحب، آپ کا مقام کہاں ہے؟''

ہمارے شہر کے ایک اور پی۔ ایچ۔ ڈی لیکچرر غالبؔ کا مشہور شعر ہمیشہ اضافت کے ساتھ یوں پڑھتے ہیں......

''نقشِ فریادی'' ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

......اور جب کوئی طالب علم انہیں ٹوک کر کہتا ہے کہ سر! وہ ''نقشِ فریادی'' نہیں، ''نقش

فریادی'' ہے تو وہ غصے سے پلٹ کر کہتے ہیں...... ''آپ کیسی گم رہی کی باتیں کرتے ہیں؟ فیض احمد فیضؔ کے مجموعہ کلام کا نام ''نقشِ فریادی'' ہی تو ہے۔''

ایک اور خاتون صحافی جو اردو میں پی۔ایچ۔ڈی بھی ہیں، ان سے پچھلے دنوں ہماری ملاقات ایک ٹیلی ویژن پروگرام کی شوٹنگ کے دوران ہوئی۔ وہاں انہوں نے کیمرے کے سامنے ایک نہیں، دو مرتبہ فرمایا کہ کوہِ طور پر حضرت محمدؐ تشریف لے گئے تھے۔ظاہر ہے ان کی پی۔ایچ۔ڈی کا موضوع کوہِ طور تو نہیں رہا ہوگا۔اسی پروگرام میں یونیورسٹی کی تین طالبات سے بھی مڈبھیڑ ہوئی جو ایم۔فل کرنے کے بعد اب مختلف موضوعات پر پی۔ایچ۔ڈی بھی کر رہی ہیں اور شعر گوئی میں بھی ملوث ہیں۔ ہم نے تینوں کے ناموزوں کلام اور غلط تلفظ سے مرصع گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے بعد ان سے دریافت کیا کہ ''بی بی، یہ بتائیے آپ پی۔ایچ۔ڈی کیوں کر رہی ہیں؟'' پہلی نے جواب دیا...... ''میرا نکاح ہو چکا ہے لیکن رخصتی میں پورے دو برس باقی ہیں کیونکہ میرے شوہر امریکہ میں پڑھائی مکمل کر رہے ہیں۔ میں نے سوچا اس عرصہ میں کیوں نہ پی۔ایچ۔ڈی کر لی جائے۔'' دوسری نے جواب دیا...... ''ہمارے ابا کہتے ہیں جب تک تمہیں شادی کے لیے لڑکا نہیں مل جاتا، تم پی۔ایچ۔ڈی کرتی رہو۔'' تیسری نے لقمہ دیا...... ''مجھے تو لڑکوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن ہم تینوں بچپن کی سہیلیاں ہیں۔اب یہ دونوں پی۔ایچ۔ڈی کر رہی ہیں اس لیے میں بھی وہی کر رہی ہوں۔''

ہمارا اپنا خیال ہے، جو صحیح بھی ہو سکتا ہے کہ جن ذہین طلبہ میں تخلیقی صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ پی۔ایچ۔ڈی کی طرف رُخ نہیں کرتے کیونکہ عموماً پی۔ایچ۔ڈی کرنے سے آدمی کے تخلیقی سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔خواتین کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔یہ عام طور پر کسی زندہ ادیب یا شاعر کی حیات اور کارناموں کو بالترتیب اپنی تفریح اور تحقیق کا موضوع بناتی ہیں اور اپنے استاد اور گائیڈ کے گھر جا کر ان کے کچن میں روٹیاں پکاتے پکاتے پی۔ایچ۔ڈی بھی ہو جاتی ہیں اور اکثر صورتوں میں انہیں عمر بھر کے لیے ایک تجربہ کار رہ نما، ایک غائب دماغ فلاسفر اور کبھی کبھی بے ضرر سا شوہر بھی مفت ہاتھ آ جاتا ہے۔

ان تمام تاریخی مثالوں پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہماری سمجھ میں فوراً یہ بات آجاتی ہے کہ اردو ادب میں آج تک جتنے بڑے محقق ہو گزرے ہیں، ان میں سے کوئی بھی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نہیں تھا۔

لیکن صاحبان...... مستثنیات کہاں نہیں ہوتے؟ آٹے میں نمک کے برابر سہی، سچے وکیل، ایماندار وزیر، عقلمند حسین، محنتی سرکاری افسر، وفادار شوہر اور قابل، باصلاحیت پی۔ ایچ۔ ڈی حضرات کبھی کبھی تیرگی کا سینہ چیر کر نمودار ہو ہی جاتے ہیں اور اپنی روشنی سے خود ہی عمر بھر حیران، پریشان رہتے ہیں۔ ہمارے آج کے ممدوح ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال تاحیات مدیر شگوفہ، بی۔ ایس۔ سی، ایم۔ اے (اردو)، پی۔ ایچ۔ ڈی (اردو) ایک ایسے ہی پروردۂ جنوں فرہاد کا نام ہے جو پچھلے ۳۷ برسوں سے ہاتھ میں تیشۂ شگوفہ لیے مصروف عمل ہے!

میں اس فرہاد کو اور اس کے جنون کو پچھلے تیس برسوں سے جانتا ہوں۔ تقریباً گیارہ فٹ کی بلند قامت شخصیت، جس کا محض نصف حصہ زمین کے اوپر دکھائی دیتا ہے، قبول صورت چہرہ جو علمیت کی چمک کی وجہ سے کچھ حسینوں کو پرکشش نظر آتا ہے، گول، بیضوی چہرے کی توقیر و آرائش کے لیے قدرت نے کچھ لمبی کچھ پھولی ہوئی ناک لگا دی ہے جو خودی کی پرورش اور انا کی حفاظت کے ساتھ ساتھ قلم کاروں کی تخلیقات کو سونگھ کر ان کے غیر معیاری ہونے کا اندازہ لگانے کے کام بھی آتی ہے۔ درمیانہ سائز کی ذہین آنکھیں جو طنز و مزاح کی صورت حال پر مسکراتے ہوئے چھوٹی ہو جاتی ہیں اور عینک کا سائز خود بخود بڑا ہو جاتا ہے۔ مسکراتے وقت ان کے سرخ ہونٹ احتیاطاً پھیل جاتے ہیں جو پچھلے کئی برسوں سے مزاح نگاری کے معیار پر قدرے مبالغے کے ساتھ تقریریں کرتے کرتے مزید سرخ ہو چلے ہیں۔ بلند اقبال کی کہانی سناتی ہوئی ڈھائی انچ چوڑی پیشانی جو کبھی گھنے سیاہ بالوں میں غروب ہو جاتی تھی، اب امتدادِ زمانہ سے بڑھ کر ساڑھے سات انچ ہو چکی ہے اور بالوں کی اکثریت بیچلر کوارٹرز کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اور شگوفہ کے لیے دھوپ میں دوڑتے ہوئے کافی حد تک غائب اور مکمل طور پر سفید ہو چکے ہیں۔ اردو تہذیب اور انگریزی لباس کے اس خوش گوار امتزاج مصطفیٰ کمال کے کان البتہ اتنے

متناسب ہیں کہ ان کے خلاف کچھ نہیں لکھا جا سکتا سوائے اس کے کہ ان کا ایک کان اپنی تعریفیں اور دشمنوں کی بُرائیاں سننے اور دوسرا کان انہیں اُڑا دینے کے کام آتا ہے۔

عام طور پر ہماری اردو شاعری کا عاشق اپنے رقیبوں اور محبوب کے والدین سے تنگ آکر کوئے یار چھوڑ کر صحرانوردی اختیار کرتا ہے لیکن اسے وہاں بھی ہر شئے میں معشوق کا جلوہ ہی دکھائی دیتا ہے......

جنگل ترے، پربت ترے، بستی تری، صحرا ترا

مگر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے اپنے غیر شاعرانہ کریئر کی ابتداء ہی جنگل سے کی تھی جہاں بی۔ایس۔سی کرنے کے فوراً بعد انہیں محکمہ جنگلات میں ''صحرادار'' کے عہدے پر ملازمت ملی تھی۔ لیکن درختوں، سبزہ زاروں اور جانوروں کی بستیوں میں انہوں نے بدعنوانیوں کی ایک نئی دنیا آباد دیکھی تو بہت مایوس ہوئے کہ ایسی دنیا تو ہم شہر میں بھی چھوڑ کر آئے تھے۔ اگر یہ سب کچھ یہاں بھی دیکھنا تھا تو انسانوں کی بستیاں ہی بھلی، جہاں پری چہرہ لوگ تو بستے ہیں جن کے سبب زندگی آسان معلوم ہونے لگتی ہے۔

چند مہینوں تک جنگلوں میں آوارہ گردی کرنے اور گیان کی تلاش میں ناکام ہونے کے بعد شہر لوٹے اور بہت جلد بیکاری سے تنگ آکر شادی یا خودکشی کرنے کی بجائے ایم۔اے (اردو) کے لیے یونیورسٹی جوائن کر لی۔ چونکہ اس زمانے میں بھی نوجوان لڑکیوں کے والدین اردو سے پی۔ایچ۔ڈی کرنے والے لڑکوں کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے، اس لیے مصطفیٰ کمال نے ایم۔اے کے فوراً بعد اپنا لہو گرم رکھنے کی خاطر کالج میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اسی دوران اپنے استاد کی ایما پر ڈیڑھ سال آرکائیوز میں بیٹھ کر تحقیق کرنے کے باوجود پی۔ایچ۔ڈی کرنے کی ہمت نہیں کی اور صحافت کے میدان میں جزوی طور پر مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ اردو تحریک سے بھی وابستہ ہو گئے اور انجمن تحفظ اردو کے پرچم تلے ساری ریاست کی سیر کرتے رہے اور اردو کے مسائل پر تقریریں کر کے فن خطابت کے رموز و نکات بھی سیکھتے رہے۔ اس درمیان چھوٹا موٹا عشق بھی کیا لیکن اپنے دل کو کبھی پاسبانِ عقل سے دور اکیلا اور تنہا نہیں

چھوڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرد کی نگہبانی میں والدین کی پسند سے ۱۹۷۲ء کے اپریل کے مہینے میں شادی کر لی اور ہنسی خوشی رہنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن یہ ان کی دوسری شادی تھی۔ پہلی شادی تو چار برس پہلے ہی ڈیڑھ ماہی شگوفہ سے ہو چکی تھی یعنی پچھلے چار برسوں میں وہ زندگی کی تلخیوں پر مزاح کے ذریعے قابو پاتے رہے تھے، اب اس شادی کے بعد گویا انہوں نے تلخیوں کے ذریعے مزاح پر قابو پانا شروع کر دیا۔

اور اس کی ضرورت بھی بہت تھی۔ ہمارے ممدوح مصطفیٰ کمال نے چار برسوں میں شگوفہ کے ذریعے اور چھ برسوں میں ''حلقہ ارباب ذوق'' اور ''زندہ دلان حیدرآباد'' کی ادبی کانفرنسوں کے ذریعے ہر مایوس شخص کو مسکرانے اور ہر خوش دل شخص کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ ذہنی اور جسمانی طور پر نسبتاً صحتمند رہتے تھے اور کیبل ٹی۔وی سے ناواقف تھے۔ آج کی طرح نہیں کہ صحتمند ہنسی غائب ہوتی جا رہی ہے اور لافٹر کلب میں لوگ اچھل اچھل کر بے معنی قہقہے لگا رہے ہیں۔ مسرت اور بصیرت کا رشتہ شگوفہ اور زندہ دلان حیدرآباد کے ذریعے کچھ ایسا جڑ گیا تھا کہ انتہائی سنجیدہ اور ثقہ قسم کے حضرات راستہ چلتے بھی کوئی نکتہ رسی اور بذلہ سنجی کی بات سن لیتے تھے تو راستہ بھر ضبط کئے زیر لب مسکراتے رہتے تھے اور گھر پہنچتے ہی کھل کر قہقہہ لگاتے تھے۔ ہمیں یاد ہے اس زمانے میں شگوفہ کے جشن مزاح کے سووینئر میں صدر جمہوریہ کے پیغام کے ساتھ خال خال مسکرانے والے محققین آل احمد سرور، احتشام حسین، مسعود حسین خاں اور گیان چند جن کے پیغامات بھی شائع ہوتے تھے جن میں لکھا ہوتا تھا کہ جب ہنسنا ہی ٹھہرا تو تھوڑی دیر کے لیے قوم کے غم کو پرے رکھ دیجیے اور مزاح کی لہروں پر بہہ جائیے۔ شگوفہ کے صفحات پر اور مزاح کانفرنسوں کے اسٹیج پر کرشن چندر، بیدی، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، مسیح انجم، شفیقہ فرحت، خواجہ عبدالغفور، فکر تونسوی اور احمد جلیس جیسے مقبول مزاح نگار اور دلاور فگار، سلیمان خطیب، رضا نقوی راہی، ہلال سیوہاروی، آفتاب لکھنوی، برق آشیانوی، اور ساغر خیامی کے علاوہ حمایت اللہ، طالب خوندمیری اور مصطفیٰ علی بیگ جیسے معیاری مزاح گو شعراء مسلسل نظر آتے تھے۔ ان میں

سے آخری تین شعراء نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک مصطفیٰ کمال طنز و مزاح کے میدان میں سرگرم عمل رہیں گے، وہ اپنی شاعری کے خزانے لٹاتے ہی رہیں گے۔

ان کے علاوہ اس زمانے میں شگوفہ کو اور مزاحیہ ادبی کانفرنسوں اور مشاعروں کو باذوق، ہنرمند اور دولت مند مگر دریادل سرپرستوں اور پُرخلوص اور متعدد رضا کار ادباء اور شعراء کا علمی تعاون حاصل تھا۔ یہاں تک کہ ان دنوں مضطر مجاز اور صلاح الدین نیر جیسے باکمال شاعر اور صحافی بھی تعمیری کام کیا کرتے تھے اور طنز و مزاح کے ساتھ مصطفیٰ کمال اور شگوفہ کے فروغ میں قدمے سخنے تعاون دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام سرگرمیاں ایک ٹیم ورک کا نتیجہ ہوا کرتی تھیں لیکن اس کی سرکاری اور غیرسرکاری سربراہی مصطفیٰ کمال کی ان پوشیدہ صلاحیتوں کے سپرد تھی جن کی انہیں خود خبر نہیں تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ادب اور کھیل کے میدانوں میں مافیا کا عمل دخل نہیں تھا اور میچ فکسنگ کے ہنر سے کیپٹن حضرات آشنا نہیں تھے۔ ایسے ساز گار حالات میں مصطفیٰ کمال شگوفے بھی کھلاتے رہے، کالجوں میں طلبہ پر اپنی کم علمی کی دھاک بھی جماتے رہے، کانفرنس اور مشاعرے بھی برپا کرتے رہے اور اپنے پُرانے اسکوٹر اور بیوی سے وفاداریاں بھی نبھاتے رہے۔

لیکن بقول مجاز آدمی کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ ۱۹۷۸ء کے آس پاس بڑے شہروں میں اسمگلروں، ہوٹل کے مالکوں، سماج کے غیر سماجی کارکنوں اور سیاسی لیڈروں اور وزیروں نے بھی اپنے نام سے پہلے ڈاکٹر کا دم چھلہ لگانے کی ہوس میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا اور خریدنا شروع کر دیا تھا، ایسے میں مسعود حسین خاں اور یو۔ جی۔ سی نے مل کر مصطفیٰ کمال کو قائل کر دیا کہ وہ بھی پی۔ ایچ۔ ڈی کی دوڑ میں شامل ہو جائیں اور انہوں نے مجبور ہو کر اپنے دس سالہ پُرانے تحقیقی کام کو چھان پھٹک کر یونیورسٹی کے حوالے کر دیا...... سپردم بتو مایہ خویش را...... عام طور پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالوں میں پُرانی شراب مزید پُرانی اور استعمال شدہ بوتل میں پیش کی جاتی ہے اور کوئی بُرا نہیں مانتا۔ اگر کسی پی۔ ایچ۔ ڈی مقالے میں ایک آدھ محققانہ انکشاف شامل ہو جاتا ہے تو نقاد حضرات اسے حیرت سے دیکھتے ہیں اور یہاں

یہ حال ہے کہ موصوف کے مقالے میں کئی انکشافات سند کے ساتھ موجود ہیں اور اس کا صلہ ہمارے ممدوح مصطفیٰ کمال کو یہ ملا کہ وہ محقق اور نقاد حضرات جو طنز و مزاح کے سلسلے میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے نہیں تھکتے تھے، انہوں نے لکھا......

"ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کو محض ہنسنے ہنسانے کی گرہ میں باندھ دینا مناسب نہ ہوگا۔ وہ سنجیدہ تر ادبی کاموں پر بھی قادر ہیں اور مجھے اُمید نہ تھی کہ شگوفہ چھیڑنے والا مدیر ایسی پُر مغز تحقیق کا کمال بھی دکھا سکتا ہے۔"

......ایک اور ممتاز پروفیسر محقق اور ناقد نے یوں ان کی کاوشوں کو شرف قبولیت بخشا......

"اس عمدہ کام میں تاخیر ان کی وہ شگوفہ کاریاں ہیں جس کا شکار وہ فارغ التحصیل ہونے کے فوراً بعد ہو گئے تھے۔ خیر صبح کا بھولا شام کو لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں سمجھنا چاہیے۔"

اس ہجو ملیح کا واحد سبب یہی ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں اور اس سے پہلے بھی طنز و مزاح کو اول درجے کی اہمیت نہیں دی گئی۔ اسے ادب کی ہلکی پھلکی صنف ہی شمار کیا جاتا رہا۔ بڑے ادبی انعامات ان مصنفوں کو ملتے رہے جو آنسوؤں کو پیدا کرنے میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ قہقہوں اور خوشیوں کے بکھیرنے والے مصنفوں اور مزاحیہ رسالوں کے مدیران کو ہمیشہ ہنسی میں ٹال دیا گیا۔ نہ پی۔ جی ووڈ ہاؤس کو نوبل پرائز ملا، نہ کرنل محمد خاں کو آدم جی انعام کے لائق سمجھا گیا، نہ رضا نقوی واہی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے مستحق ٹھہرے اور مصطفیٰ کمال کے تحقیقی کارنامے پر ان کی مزاح نوازیوں اور شگوفہ کاریوں کے سائے منڈلاتے رہے۔ طنز و مزاح کی خدمت کے لیے اتنی بڑی قربانی شاید ہی کسی نے دی ہو۔ لیکن مصطفیٰ کمال ان نوازشوں پر ہمیشہ اپنی نیم وا آنکھوں اور واشگاف ہونٹوں والی مسکراہٹ نچھاور کرتے رہے......

مسکرانے کی سزا شوق سے دینا مگر
اور کچھ دیر سرِ شاخ سجا رہنے دے

یوں بھی خدا اور ایوارڈ کمیٹی کے چیئرمین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ خدا پُرخلوص

بندے کی خدمت کو انعام واکرام دینے کے معاملے میں فیصلہ خود کرنے کے بعد اس کا الزام کسی کمیٹی کے سر نہیں ڈالتا۔ اس نے تقریباً ۶۶ ر برس کی عمر کے نوجوان مصطفیٰ کمال کو اتنی دانائی، بینائی اور توانائی بخشی ہے کہ وہ رٹائرمنٹ کے بعد بھی شگوفہ کے ساتھ ساتھ پچھلے سات برسوں میں اردو کی تقریباً ۲۰۰ ر درسی کتابوں کے ترجمے اور تدوین کی ذمہ داریوں سے بھی اردو یونیورسٹی میں عہدہ برآ ہو چکے ہیں۔

اب جو شگوفہ نے اپنی عمر عزیز کے تقریباً ۳۷ رسال پورے کر لیے ہیں تو اس کا موازنہ ظاہر ہے لکھنؤ کے اودھ پنچ کے تقریباً ۳۶ ر برسوں کے دور سے کیا جا رہا ہے گویا اودھ پنچ کو بند کرانے کا کارنامہ بھی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال ہی نے انجام دیا تھا تاکہ وہ شگوفہ کو اس سے آگے لے جاسکیں۔ حالانکہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اردھ پنچ کے ایڈیٹر منشی سجاد کا انتقال محض ۵۶ ر برس کی عمر میں ہو گیا تھا اور ہمارے ممدوح ۶۶ ر برس کی طبعی عمر اور تقریباً ۹۶ ر برس کی ذہنی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی نوجوان اور پھرتیلے ہیں۔ خدا انہیں نظر بد سے بچائے اور شگوفہ کو لمبی عمر عطا کرے۔ منشی سجاد، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ اس کے باوجود بلکہ اس کے باوصف ایک صاحب طرز طنز مزاح نگار اور ناول نویس تھے اور انہوں نے دو مقبول مزاحیہ کردار حاجی بغلول اور احمق الدین بھی تخلیق کیے تھے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے اس طرح کے کئی کرداروں کی تربیت کی ہے جو کبھی کبھی مزاحیہ مشاعروں میں نظر آجاتے ہیں۔ مصطفیٰ کمال اور شگوفہ کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ خود مزاح نگار نہیں ہیں لیکن اچھے اور برے طنز و مزاح کو دودھ اور پانی کی طرح الگ کر دینے کے بعد دونوں قسم کی تخلیقات کو اہتمام سے شائع کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

ہمیں نہیں معلوم کہ مصطفیٰ کمال کے کمالات اور ان کی کامیابیوں میں بیگم کمال کا کتنا ہاتھ رہا ہے لیکن اتنا جانتے ہیں کہ کمال کے کارناموں کے سبب پوری اردو دنیا میں بیگم کمال کا نام بے حد عزت واحترام سے لیا جاتا ہے اور جب بھی اہل زبان اپنی بیگمات سے خوش ہوتے ہیں تو ان کے منہ سے یہی کلمۂ تحسین نکلتا ہے...... "آپ کمال کی بیگم ہیں......!" انتہائی مسرت کے عالم میں وہ یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے...... "بیگم، آپ تو

واقعی کمال کی بیوی ہیں۔" کبھی کبھی بے حد بے ضرر قسم کے باکمال انسانوں کو دنیا اس طرح بھی نوازتی ہے۔

ابھی زیادہ دن نہیں گزرے، مصطفیٰ کمال کے ایک دشمن نما دوست نے ان سے کہا۔ "کمال صاحب، اب بس بھی کیجئے۔ اب طنز و مزاح کے دشت میں ویرانی سی ویرانی بڑھتی جا رہی ہے۔ اب آپ بھی شگوفہ کے دفتر کو کسی اشتہاری ایجنسی کے حوالے کیجئے اور گھر جا کر (اپنے گھر!) آرام کیجیے۔ یہ سن کر مصطفیٰ کمال نے پھر وہی اپنی مخصوص ہنسی بکھیری، عینک اُتار کر اسے خواہ مخواہ صاف کیا اور پھر کہنے لگے......

اجاڑ دشت میں بس جائے میری ویرانی
عجب نہیں کہ یہیں کوئی گھر نکل آئے

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے شگوفہ کے اتنے ضخیم اور وقیع نمبر شائع کیے اور کل ہند کانفرنسوں اور ورلڈ ہیومر کانفرنس کے ذریعے طنز و مزاح کے جراثیم کو اتنا پھیلا دیا کہ ارباب اقتدار کو مجبور ہو کر مزاحیہ ادب کو یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کرنا پڑا تا کہ وہ اساتذہ بھی اسے پڑھنے پر مجبور ہو جائیں جو اس کا مطالعہ کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے اور اب اسے پڑھ کر بہتر تدریس اور حسب توفیق بہتر تنقید و تحقیق کا کام انجام دے سکیں۔

آج جبکہ طنزیہ و مزاحیہ ادب کا معیار مشتاق احمد یوسفی، مشفق خواجہ، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین دلاور فگار اور رضا نقوی واہی تک پہنچ کر، کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد مائل بہ زوال نظر آنے لگا ہے، مصطفیٰ کمال کو ایک کارٹونسٹ کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ ایک ایسی اونچائی پر کھڑے نظر آتے ہیں جس کے دونوں طرف ڈھلانیں ہیں۔ ایک ڈھلان سے ہم ایسے کم معیاری ادیب انہیں نیچے کھینچ رہے ہیں تو دوسری ڈھلان سے مزاحیہ مشاعروں کے شاعر انہیں نشیب میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں اور مصطفیٰ کمال شگوفہ کو اپنے سینے سے لگائے اپنی جگہ پر مستقل مزاجی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں۔ رسہ کشی جاری ہے اور ابھی تک ان کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں نہیں ہوئے ہیں۔

○○

سمندر کو جو پی جاتے ہیں

ڈیل کارنیگی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اچھی گفتگو میں مہارت حاصل کرنے کے لیے دوسروں کی باتیں غور سے سننے والے کانوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ گفتگو کا فن نہیں جانتے یا بغیر گالیوں کے بات چیت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں انہیں چاہیے کہ سب سے پہلے ای۔این۔ٹی اسپیشلسٹ کے پاس جا کر اپنے کانوں کا علاج کرائیں۔ وہ بیویاں جو اپنے شوہروں کو بولنے ہی نہیں دیتیں اور مسلسل چخ چخ یعنی Nagging کرتی رہتی ہیں وہ خود تو ماہر گفتگو نہیں بن پاتیں لیکن ان کے شوہر ان کی بدولت گھر سے باہر کی دنیا میں ایک اچھے مقرر ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں ایسے بہت کم لوگ ہیں جن کی قوت سماعت اور زور خطابت دونوں ہی قابل رشک بھی ہوں اور اپنے ہی زور بازو کا نتیجہ بھی ہوں۔ یعنی وہ اچھے سمیع بھی ہوں اور عمدہ خطیب بھی۔ ایسے لوگ عموماً کامیاب و کامران بھی ہوتے ہیں اور کسی بڑے ادارے کے اور کمپنی کے سربراہ بھی۔ لیکن ایسے لوگ کبھی طویل تقریر نہیں کرتے۔ مبادا سامعین یہ سمجھنے لگیں کہ موصوف نے ڈیل کارنیگی کی کتابوں کو گھول کر پی لیا ہے۔ جن لوگوں نے جناب سمیع خطیب کی شگفتہ تقریریں پہلے سنی ہیں اور ڈیل کارینگی کو بعد میں پڑھا ہے، ان کا خیال ہے کہ مصنف نے سمیع خطیب کو سامنے رکھ کر اپنی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

ہمارے ہاں ایک بڑی غلط کہاوت عام ہے کہ ہر کامیاب شخص کے پیچھے ایک عورت ہوتی

ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ اگر کامیاب آدمی نیک ہے تو ایک اچھی بیوی اس کے پیچھے نہیں بلکہ اس کا ہاتھ تھامے اس کے دُکھ درد میں، اس کی خوشی اور کامرانی میں قدم سے قدم اور کندھے سے کندھا ملائے اس کے ساتھ رہتی ہے اور آدمی کامیابی کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے جس کی زندہ مثال ہمارے ممدوح سمیع خطیب ہیں، اور اگر کامیاب آدمی نیک نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، تو یقیناً اس کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے لیکن اس عورت کے پیچھے بھی ایک عورت ہوتی ہے جس کے پیچھے ایک اور...... اور یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے اور آدمی اڑانیں بھرتا ہوا گلستان سے قبرستان کا فاصلہ بہت کم عرصہ میں طے کر لیتا ہے۔

آزادی سے کچھ برس پہلے کا ذکر ہے۔ کسی گاؤں میں بہت سے لوگ ایک ٹیلے پر جمع ہو کر چلاّ چلاّ کر خدا سے دعائیں مانگ رہے تھے کہ ''اے خدا، ہمیں اس خشک سالی سے نجات دے دے اور بارش بھیج دے۔'' وہاں سے ایک شخص اپنے چھوٹے سے بچے کی انگلی تھامے گزر رہا تھا۔ اس بچے نے اپنے باپ سے پوچھا...... ''یہ لوگ اتنا چلاّ کیوں رہے ہیں؟'' باپ نے بچے کو سمجھایا کہ گاؤں والے خدا سے برسات کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ بچے نے کہا۔ ''ابو، اگر یہ لوگ خدا کے کہیں قریب رہتے تو انہیں اس قدر چلاّنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

اس شخص کا نام عبدالمجید تھا اور اس کے معصوم بچے کا نام محمد سمیع تھا جسے آج ہم اور آپ سمیع خطیب کے نام سے جانتے ہیں۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے چوتھے برس، ساتویں مہینے کے ساتویں دن اس ذہین بچے کی پیدائش مہاراشٹر کے ایوت محل ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک ایسے مکان میں ہوئی جس کا فرش، چھت اور دیواریں، سبھی مٹی کے بنے ہوئے تھے اور بیت الخلا کی سہولت مکان کے اندر نہیں تھی۔ وہیں اس نے تقسیم ہند کے المیے اور فسادات کو دیکھا اور سہا۔ ۱۹۵۱ء میں میٹرک کے امتحانات کے بعد چھٹیوں کا یوں استعمال کیا کہ گھر کے باہر لگے آم کے پیڑوں سے ہونے والے کاروبار کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس سال اتنی اچھی فصل ہوئی اور اتنا

زبردست کاروبار اور منافع ہوا کہ والد نے پیشین گوئی کردی...... "یہ لڑکا بڑا ہوکر مٹی کو بھی ہاتھ لگائے گا تو وہ سونا بن جائے گی۔" لیکن ابھی اس پیشین گوئی کو سچ ہونے میں دیر تھی۔ ناگپور سے انٹر سائنس کرنے کے بعد بی۔ ایس۔ سی کرنے اور اپنی ہونے والی بیگم سے ملاقات کی خاطر اسمٰعیل یوسف کالج، جوگیشوری، ممبئی چلے آئے۔ پھر ناگپور کی یاد آئی تو وہاں سے بی۔ فارم اور ایل۔ ایل۔ بی ہنستے کھیلتے کرلیا۔ پھر ممبئی نے ان کا دامن کھینچا تو جمنالال بجاج انسٹی ٹیوٹ سے مینجمنٹ کی سند حاصل کرلی۔ اس کے فوراً بعد سات برس تک فرنچ کمپنی میں یوں ملازمت کی کہ فرانسیسیوں کے صرف اچھے عادات واطوار اور خوبیوں کو اپنایا۔ شادی یقیناً اپنی پسند کی لڑکی سے کی لیکن یہ ایک منظم شادی یعنی Arranged Marriage تھی۔ خود ان کے ہی الفاظ میں...... "بھئی فیضی صاحب! محبت ہم نے شادی کے بعد کی، اس لیے کہ اس زمانے کا یہی دستور تھا۔"

ملازمت کے پہلے ڈیڑھ برسوں تک کاندھوں پر گرہستی کا بوجھ اور ہاتھوں میں میڈیکل ریپ کا وزنی بیگ اُٹھائے اچھے، بُرے ہر قسم کے ڈاکٹروں کے در پر دستک دیتے رہے۔ پھر اگلے پانچ برسوں میں دو مرتبہ ترقی پاکر آخر کار منیجر کی حیثیت سے ممبئی پہنچے تو ایئر کنڈیشنڈ کیبن اور گھومنے والی کرسی دونوں ان کے منتظر تھے۔ مگر اس آرام دہ ملازمت سے انہیں کہاں قرار ملتا، چنانچہ چار بچوں سمیت چھ افراد کے خاندان کے آرام وآسائش اور پروویڈنٹ فنڈ کے باسٹھ ہزار روپیوں کو داؤ پر لگا کر دواسازی کے کاروبار میں کود پڑے۔ گرتے سنبھلتے جدوجہد کرتے رہے مگر پلٹ کر کبھی نہیں دیکھا اور بہت کم عرصہ میں برسوں پہلے والد کی پیشین گوئی کو پورا کردکھایا۔ آج وہ کئی مشہور دوائیں بناتے ہیں مگر انہیں مریضوں کو دینے کی بجائے پہلے ڈاکٹروں پر آزماتے ہیں۔ جب ڈاکٹروں کو اطمینان قلب میسر آجاتا ہے، تب عام آدمی ان سے مستفیض ہوتا ہے۔

سمیع خطیب کی ظاہری شخصیت انتہائی سادہ اور قدرے مغالطہ آمیز ہے۔ صحتمند جسم، لباس سے سادگی اور سلیقہ مندی عیاں، قد زیادہ نہ کم اور طبیعت ایسی کہ جو قد خدا نے عطا کیا اسی پر قناعت کرلی۔ کبھی اپنا قد نارمل سے زیادہ اونچا کرنے کی کوشش نہیں

کی۔ داڑھی، مونچھ اور غرور سے بے نیاز گول بیضوی بھرا بھرا چہرہ برسوں کی ریاضت اور محنت سے تمتمایا ہوا۔ پیشانی قدرتی طور پر چوڑی جو نہ کبھی شکن آلود رہتی ہے نہ عرق آلود۔ بس مسکراتے ہوئے اپنی خوش بختی کی کہانی سناتی رہتی ہے۔ کان انہیں قدرت نے اوسط سے ذرا زیادہ بڑے دیئے ہیں تاکہ ہم ایسے نادان دوستوں کے علاوہ اپنے دانا مخالفین کی باتیں بھی ''کشادہ کانی'' کے ساتھ سن سکیں۔ بالوں نے ابھی ان کا ساتھ چھوڑا نہیں ہے اور محبت کرنے والے بال بچوں کی طرح ان کے سر چڑھے رہتے ہیں۔ صرف کہیں کہیں نئی صبح کی سفیدی پھوٹ رہی ہے۔ دشمنوں کا کہنا ہے کہ وہ خضاب اس کمال کے ساتھ لگاتے ہیں کہ کہیں کہیں سفیدی جھلکتی رہے۔ آپ کہیں گے اتنے اچھے انسان کے دشمن کیوں ہیں؟ جواباً عرض ہے کہ اچھے انسانوں کے ہی دشمن ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ کبھی سب کو خوش کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید بڑی آسانی سے کہہ جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا کہ فلاں شخص کیوں تمہارے خلاف اتنی باتیں کہہ رہا تھا، کیا تم نے کبھی اس پر احسان کیا تھا؟

جناب سمیع خطیب کی ناک بالکل ایسی ہے جیسی کہ ایک شریف آدمی کی ہونی چاہیے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ناک کی کبھی لاڈلے بچے کی طرح پرورش نہیں کی اور اسے اپنی شخصیت سے زیادہ اونچا نہیں ہونے دیا۔ ورنہ فی زمانہ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کی ناک اتنی اونچی ہوتی ہے کہ وہ خود اس کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ لیکن سمیع خطیب کے چہرے پر جو سب سے اہم اور سب سے قاتل شئے ہے، وہ ان کی آنکھیں ہیں جو بظاہر تو عام سی ہیں اور ان میں کوئی محبوبیت نہیں ہے لیکن یہ سمجھداروں کے لیے پیغام رسانی کا کام مسلسل انجام دیتی رہتی ہیں۔ کوئی کتنا ہی خوبصورت یا خوب سیرت کیوں نہ ہو، سمیع خطیب اسے آنکھیں پھاڑ کر نہیں دیکھتے۔ وہ دنیا کا مشاہدہ گوتم بدھ کی طرح ہمیشہ نیم باز یعنی ادھ کھلی آنکھوں سے کرتے رہتے ہیں۔ کسی سے ناراض ہو جائیں تو چہرے پر کھلنے والی مسکراہٹ ذرا ہلکی ہو جاتی ہے اور آنکھیں سکڑ کر صرف ایک چوتھائی کھلی رہ جاتی ہیں، اور اگر خوش ہو جائیں تو یہی آنکھیں مزید سکڑ کر ایک بٹا آٹھ رہ

جاتی ہیں، ان میں شراب کی سی مستی آجاتی ہے اور چہرے پر کلیاں کھلنے لگتی ہیں۔ ایسی آنکھوں سے انہوں نے مجھے آج تک نہیں دیکھا۔

سمیع خطیب کی شخصیت میں جتنی اور جس قسم کی کمزوریاں ہیں، وہ ایک کامیاب انسان میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ قوم کے غم میں وہ کبھی آنسو نہیں بہاتے، اپنے دست شفقت سے اس کے آنسوؤں کو مسکراہٹ میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسروں کے آنسو پونچھنے کے لیے وہ ایک الگ رومال رکھتے ہیں جو کبھی خالی نہیں رہتا۔ اس میں ان کے خلوص کی خوشبو اور کبھی کبھی مہاتما گاندھی کی تصویر چھپی ہوتی ہے۔ دوسروں کی مدد کرنا ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ مدد کرتے وقت وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ جس شخص کی وہ مدد کر رہے ہیں اس میں کچھ بُرائیاں تو نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اچھوں کی مدد تو سبھی کرتے ہیں، اگر کوئی کم اچھا اور کم بُرا شخص ایسا کام کر رہا ہے جس میں بڑی خوبیاں ہیں اور قوم کا مفاد مضمر ہے تب بھی ہمیں اس کی مدد کرنے میں پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ ایک مرتبہ ایک ایسی ہی درخواست پر انہوں نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے اور مالی امداد سے گریز کرتے ہوئے اپنے آرکیٹیکٹ انجینئر اور کانٹرکٹر کو بھیج کر کئی لاکھ کے صرفے سے اسکول کی عمارت کھڑی کر دی اور اس عمارت کو اپنے نام سے منسوب کرنے کی تجویز کو بھی سختی سے ٹھکرادیا۔

چند افراد کو چھوڑ کر ممبئی شہر کے ہر آدمی کی یہی رائے ہے کہ سمیع خطیب بہت بڑے آدمی ہیں اور ایک اچھے نیک انسان بھی ہیں۔ ہمیں اس سے سخت اختلاف ہے۔ اس لیے کہ یہ کہنا ایسا ہی ہے کہ فلاں صاحب پیشے سے وکیل ہیں اور ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے، ایک انسان بیک وقت بڑا آدمی اور اچھا یا نیک آدمی کیسے ہو سکتا ہے۔ فی زمانہ بڑا آدمی ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں اچھائی اور نیکی برائے نام بھی نہ ہو۔ ظاہر ہے سمیع خطیب اس کسوٹی پر پورے نہیں اُترتے۔ بڑے آدمی کی دوسری پہچان یہ ہے کہ وہ ڈگری یافتہ ہونے کے باوجود مہذب نہیں ہوتا اور تعلیم یافتہ نہیں معلوم ہوتا۔ جبکہ سمیع خطیب جتنی ڈگریوں کے مالک ہیں اس سے کہیں زیادہ خوش مزاجی

اور تہذیب اور کردار کے غازی ہیں۔ گفتار کے معاملے میں البتہ وہ کنجوس واقع ہوئے ہیں اور بڑے آدمیوں کے برعکس بڑی بات کو بھی چھوٹے جملوں اور کم سے کم وقت میں کہہ جاتے ہیں اور چھوٹی بات کو کہنا تو وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس کے لیے وہ صرف آنکھوں کی جنبش سے کام نکال لیتے ہیں۔ بڑے آدمی کی گردن غرور سے تنی ہوتی ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں پر گالیاں اور ماتحتوں پر فائلیں پھینکتا ہے۔ دراصل بڑے آدمی کو عیش میں یادِ خدا نہیں رہتی اور طیش میں خوفِ خدا نہیں رہتا۔ اس کے برخلاف سمیع خطیب سبھی سے اتنی شگفتگی اور نرمی سے گفتگو کرتے ہیں کہ مخاطب خوش فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ کسی پر غصہ آ جائے تو وہ اس سے اور زیادہ بلکہ غیر معمولی نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں اور سمجھدار سمجھ جاتا ہے کہ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو سمیع خطیب خفا ہیں۔

ہر بڑے آدمی کی گڈ بک (Good Book) میں محض گنے چنے نام ہوتے ہیں اور اس کی بیڈ بک (Bad Book) یعنی بُرے آدمیوں کی کتاب بھری کی بھری رہتی ہے۔ جبکہ سمیع خطیب کی گڈ بک شاخ نہال غم کی طرح ہمیشہ ہری کی ہری رہتی ہے اور بیڈ بک عام طور پر طاق پر دھری رہتی ہے۔ اگر کوئی اچھا آدمی بھی غلطی یا بُرائی کر جائے تو اس کا نام گڈ بک سے خارج نہیں کرتے، اس کے نام کے آگے ایک سیاہ نقطہ لگا دیتے ہیں تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ شاید اسی لیے وہ ہر ایک کے دوست ہیں اور سوائے تکبّر کے کسی اور سے ان کی دشمنی نہیں ہے۔ اس لیے کہ عجز اور انکسار ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اتنا کوٹنے کے باوجود خراب نہیں ہوا ہے۔ پھر ان کے انکسار میں بھی ایک ادا، ایک بانکپن ہے۔ وہ ہر ہندوستانی ملاقاتی کا استقبال مسکرا کر کرتے ہیں اور ہر غیر ملکی مہمان سے جھک کر ملتے ہیں۔ لیکن اتنا بھی نہیں جھکتے کہ کوئی پردیسی آئے، ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھے اور انہیں آم کا پیڑ سمجھ کر خرید کر لے جائے۔ اسی طرح اگر کوئی ان کی نرمی اور سادگی کا فائدہ اُٹھا کر ان کی تقریر میں مداخلت کرے تو وہ بڑی شائستگی سے مداخلت کار کو آدابِ محفل کا درس دے کر خاموش

کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔

ہم نے بارہا سنا ہے، آپ نے بھی سنا ہوگا، ہماری قوم کے بڑے لوگ اپنی ہر دوسری تقریر میں علامہ اقبال کو کوٹ (Quote) ضرور کرتے ہیں......

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

......اور ہم نے دیکھا ہے، آپ نے بھی بارہا دیکھا ہوگا کہ یہ اشعار پڑھنے کے بعد جب ہماری قوم کے یہ بندہ نواز محمود نماز کے لئے پہنچتے ہیں تو پہلی صف میں عین پیش امام کے پیچھے ان کے لیے مخصوص نشست خالی رہتی ہے اور قوم کے ایاز اُن کے منتظر رہتے ہیں۔ ہمارا اپنا تجربہ ہے کہ بڑے آدمیوں کے جتنا نزدیک جایئے وہ قریب جانے پر اتنے ہی چھوٹے نکلتے ہیں۔ سمیع خطیب ان معنوں میں بھی بڑے نہیں کہ ان کی بزم میں جانے پر ان کی شخصیت کی اور پُرکشش پرتیں کھلتی ہیں اور وہاں سے لوٹ کر آنے کو جی نہیں چاہتا......

چلے تھے اک نظر تیری بزم دیکھ آئیں
یہاں جو آئے تو بے اختیار بیٹھ گئے

بڑے آدمیوں کے مکان کے گیٹ پر ''کتوں سے ہوشیار'' کا کتے کی ہی سائز کا بڑا سا بورڈ لٹکا رہتا ہے۔ جسے پار کرنے کی انسانیت سوز حرکت کرنے پر پہلے کتوں کے بھونکنے کی اور پھر مالک مکان کے چیخنے کی آوازیں آتی ہیں، کہ پتہ ہی نہیں لگتا کہ کون کس سے مخاطب ہے۔ سمیع خطیب نجس اور ناپاک جانوروں اور جانداروں سے دور ہی رہتے ہیں۔ وہ کیسے بڑے آدمی کہلا سکتے ہیں۔ بڑے آدمی کے بڑے مکان کا داخلی دروازہ تو بہت بڑا اور اونچا ہوتا ہے۔ مگر اندرونی اور بغلی دروازے بہت چھوٹے اور تنگ، اپنے مالک کی ذہنیت کے گن گا رہے ہوتے ہیں۔ سمیع خطیب کے مکان کے تمام دروازوں کا سائز ایک سا ہے۔ یہاں تک کہ کھڑکیاں بھی دروازوں کے سائز کی ہیں

جہاں بادِ نو بہار کے جھونکے بآسانی داخل ہو سکتے ہیں۔ بڑے آدمی کے چوکیدار پُرانی اور چھوٹی گاڑیوں میں آنے والوں کا سواگت بے رُخی سے، بڑی اور قیمتی کاروں سے اُترنے والوں کی آؤ بھگت سلام سے اور آٹو رکشہ یا پیدل آنے والوں کا استقبال سوال سے کرتے ہیں۔ سمیع خطیب کے مکان پر اگر کوئی ہماری طرح سیکنڈ ہینڈ کھٹارا گاڑی یا آٹو رکشہ سے پہنچے یا پیدل چلا آئے تو چوکیدار حضرات گرم جوشی سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ وہ سوچتے ہیں کہ ہو نہ ہو، یہ کوئی شاعر، ادیب یا ٹیچر ہوگا جن کی صاحب بہت عزت کرتے ہیں۔ قلمکاروں کی ہر زاویے سے عزت افزائی کرنا سمیع خطیب کی فطرت ثانیہ بن چکا ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مہاراشٹر کے ایوت محل ضلع کے جس گاؤں میں وہ پیدا ہوئے اس کا نام ہی ''قلم'' ہے۔

اور آج جبکہ قلم کا یہ سپاہی قول و فعل کا دھنی یہ شخص، جسے ہم اور آپ سمیع خطیب کے نام سے جانتے ہیں...... وہ عمر کی بہترویں منزل پر ہیں اور اتفاق رائے سے بہتر فرقوں میں بٹی قوم کی سب سے بڑی انجمن کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ ان کا عزم جوان اور ارادے بلند ہیں اور وہ جوشؔ کی اس رباعی کی مجسم تفسیر بنے سرگرم عمل ہیں......

گرداب میں بھی بصد خوشی جاتے ہیں
یوں جھوم کے مرتے ہیں کہ جی جاتے ہیں
تم وہ ہو سمندر جنہیں کھا جاتا ہے
ہم وہ ہیں سمندر کو جو پی جاتے ہیں

OO

نوٹ: ممبئی کے مشہور و معروف صنعت کار جناب سمیع خطیب (چیئرمین، میڈلے فارماسیوٹیکلز اور سرپرست انجمن ترقی اردو (ہند) مہاراشٹر) کے انجمن اسلام، ممبئی کا صدر منتخب ہونے پر ایک تہنیتی تقریب میں یہ خاکہ پڑھا گیا۔

کالی داس گپتا رضا...... زمانے کو رہیں گے یاد برسوں

ہم آج بھی جب کسی محقق اور دانشور کا تصور کرتے ہیں تو ذہن میں ایک ایسے معمر اور پریشان حال شخص کی تصویر اُبھرتی ہے جس کے چاروں طرف سینکڑوں کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ جن کے مطالعہ کے شوق نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہو۔ ایک ہاتھ میں نازک سا قلم اور دوسرے ہاتھ میں کبھی محدب عدسہ تو کبھی بھاری بھرکم پائپ ہو جس سے اُٹھتا ہوا دھواں اس کی دانشوری کی غمازی کر رہا ہو اور جو سر کی جنبش سے اپنے بالوں کو پیچھے کی طرف دھکیلنے اور بیک جنبش قلم اپنے پیش رووں کی تحقیق کو ردّ کرنے میں مصروف ہو۔ ایسے ''تردیدی محققین'' سے ہم ہمیشہ مرعوب رہتے ہیں اور ان کی دل سے عزت کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں بڑا رشک آتا ہے اور کبھی کبھی ہم حسد بھی کرتے ہیں یونیورسٹی اور کالج کے ان اساتذہ حضرات سے جو کبھی اپنی تو کبھی اپنے مقبول شاگردوں کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی خاطر محض دو عدد تحقیقی کتابوں کے مطالعہ کے بعد تیسری تحقیقی کتاب وجود میں لے آتے ہیں۔ ان کے بھی ایک ہاتھ میں قلم ہوتا ہے لیکن دوسرے ہاتھ میں محدب عدسے یا پائپ کی بجائے قینچی ہوتی ہے جس کا استعمال وہ کسی سرجن کی سی مہارت کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ اپنے پیش رووں کی تحقیق کو ردّ نہیں کرتے بلکہ اس پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں اور ''تصدیقی محقق'' کہلاتے ہیں۔ یہ مختلف ناموں سے تحقیقی کارنامے انجام دیتے ہیں اور ہر کارنامے کے بعد ان کی عینک پہلے سے زیادہ سنہری اور جسم اور بینک بیلنس پہلے سے زیادہ فربہ ہو جاتا ہے۔

لیکن آج سے تقریباً بیس برس پہلے جب ہم نے پہلی مرتبہ مشہور محقق ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا کو دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ کوئی دانشور جسمانی اور ذہنی طور پر اتنا صحتمند اور پرُکشش بھی ہو سکتا ہے۔ وہ مال وزر اور علم کی دولت کی فراوانی کے باوجود اتنا حلیم اور منکسر المزاج بھی ہو سکتا ہے۔ ورنہ ہم نے ایسے نہ جانے کتنے شاعر وادیب دیکھے ہیں جن کی گردن فٹ پاتھ سے فلیٹ اور گمنامی سے شہرت کی منزل تک سفر کے دوران اکڑتی جاتی ہے، پاؤں زمین چھوڑ دیتے ہیں، نگاہ تکبر سے بلند ہو جاتی ہے اور دل نوازیٔ سخن منافقت کی مرہون منت ہو جاتی ہے۔ گپتا جی سے ہماری یہ پہلی ملاقات ایک ایسے تہنیتی جلسے میں ہوئی تھی جو انہیں غالب ایوارڈ ملنے پر منعقد کیا گیا تھا۔ وہیں ہمیں پتہ چلا کہ وہ چار درجن سے زائد کتابوں کے مصنف، مولف اور مرتب ہیں اور اپنی ادبی خدمات کے عوض درجن بھر ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن ہماری اس بے خبری کی وجہ ہماری کم علمی سے زیادہ ان کی گوشہ نشینی تھی جو آج بھی انہیں محفلوں سے دور رکھتی ہے اور خود اپنی پبلسٹی اور پی۔ آر۔ شپ کے گُر بھی نہیں سیکھنے دیتی۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ اگلے برس ہی حکومت کی نا اہلی اور سیاستدانوں کی غلط فہمی کے سبب ہمیں ریاستی اردو اکادمی کا ممبر اور جوائنٹ سکریٹری مقرر کر دیا گیا۔ اکادمی کی پہلی میٹنگ میں ہم علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری اور کالی داس گپتا رضا جیسے بزرگوں کی موجودگی میں تقریباً خاموش ہی بیٹھے رہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ نہ صرف ہماری تہی دامنی کا راز افشا نہیں ہوا بلکہ ہم گپتا جی کو بھی اپنی سعادت مندی سے متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد گپتا جی کے مکان پر، اکادمی کی میٹنگوں میں اور ٹیلی فون کے ذریعہ ان سے طویل ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ بعد میں فیکس کی آمد پر ان کی طویل گفتگو فیکس سے بھی درآمد ہونے لگی اور ان کی تہہ در تہہ شخصیت کی پرتیں ہم پر کھلنے لگیں۔ ہماری اپنی شخصیت کی پرتیں کھولنے میں گپتا جی البتہ کامیاب نہ ہو سکے اس لیے کہ اس میں پرتوں کا وجود ہی نہ تھا۔

کالی داس گپتا رضا ایک نامور محقق اور اچھے شاعر ہونے کے باوجود ایک اچھے

انسان بھی ہیں۔ ورنہ پتہ نہیں کیوں بہت سے اچھے شاعر ذاتی زندگی میں اپنے ہر فعل سے اپنی ہی شاعری کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے اعمال کا کفارہ شاعری کے ذریعے ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔ یوں تو قدرت نے گپتا جی کو دولت سے بھی نواز رکھا ہے لیکن وہ بھی انہیں بگاڑنے میں ناکام نظر آتی ہے۔ ایک کامیاب بزنس مین ہونے کے باوجود حیرت انگیز طور پر وہ ایماندار اور لین دین میں کھرے ہیں۔ تجارتی لین دین میں کبھی کسی سے کمیشن نہیں لیتے لیکن اردو اکادمی نے مہاراشٹر کی لائبریریوں کے لیے ان کے اشاعتی ادارے سے کتابیں خریدنی چاہی تو انہوں نے انتہائی فیاضی کے ساتھ نہ صرف کتابوں پر زیادہ سے زیادہ کمیشن دیا بلکہ اپنی جانب سے زائد کتابیں ان لائبریریوں کو بھیجنے کی تجویز رکھی اور اس پر عمل بھی کیا۔ سچ پوچھئے تو ان سے ملنے کے بعد ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ اپنی گاڑھی کمائی کو اردو زبان کی اشاعت پر لٹانے اور اردو ادیبوں شاعروں کی چوری چھپے امداد کرنے کے عمل کو اردو کی خدمت کہا جاتا ہے ورنہ اس سے پہلے ہم یہی سمجھتے رہے تھے کہ اردو کی خدمت کے معنی یہ ہیں کہ اردو کو روزگار کا ذریعہ بنایا جائے اور ریڈیو، ٹیلی ویژن کے پروگراموں، اکادمی کے سیمناروں اور مشاعروں میں شرکت کے ذریعے اور اپنی تصنیفات پر حکومت سے امداد اور انعامات حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ روپیہ کمایا جائے اور اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے اردو زبان کی کسمپرسی کا رونا رویا جائے۔

جو لوگ کالی داس گپتا رضا کو جانتے ہیں انہیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ مرزا غالبؔ، رضا صاحب کی کمزوری ہیں لیکن سچ پوچھئے تو ضرورت مند شعراء اور ادباء کی مدد کرنا ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی روز وہ غالبؔ کے متعلق بالکل نہ سوچیں لیکن یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی دن ایسا گزر جائے جب انہوں نے کسی ضرورت مند کی چشم نم کو تر ہونے سے بچایا نہ ہو۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ایک صاحب لکھنؤ سے بمبئی تک کا سفر سال میں ایک سے زائد مرتبہ طے کر کے کبھی اپنی کتاب کی اشاعت کے لیے، کبھی مطبوعہ تصنیف کی نکاسی کے لیے تو کبھی بیٹی کی شادی کے لیے رقم

اکٹھا کرنے کے لیے تشریف لاتے تھے۔ ظاہر ہے رضا صاحب کے در پر ضرور صدا لگاتے تھے جہاں ان کا استقبال معزز مہمان کی طرح کیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ موصوف نے گپتاجی کے ہاں سے بامراد لوٹنے کے بعد اپنے کسی شناسا سے ان کے بارے میں کوئی نازیبا بات کہہ دی جس کی بھنک گپتاجی کے کانوں تک بھی کسی طرح پہنچ گئی۔ اس کے چند مہینوں بعد ہی لکھنوی شاعر دوبارہ ممبئی آدھمکے اور چونکہ وہ اپنی غیرت مندی کو لکھنؤ ہی میں طاق پر چھوڑ آئے تھے، اس لیے دوبارہ گپتاجی کے ہاں حاضر ہو گئے۔ ہم خوش ہوئے کہ اب ان کی اچھی سرزنش ہو گی لیکن توبہ کیجیے صاحب...... کیسی سرزنش، اور کہاں کی گوش مالی۔ انہیں تو حسب سابق ہر مطلوبہ شئے سے سرفراز کیا گیا اور وہ اپنا حقِ محنت وصول کر کے ہی لوٹے۔ اس روز ہماری سمجھ میں آیا کہ گپتاجی غالبؔ کو صرف گھول کر پی نہیں گئے ہیں بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہیں......

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

الغرض رضا صاحب میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ایک ادیب و شاعر کے لئے قطعی غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں اور جن کی موجودگی ایک تاجر کو دیوالیہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ ہم نے جب ان سے دریافت کیا کہ اب تک اپنے آپ کو دیوالیہ ہونے سے انہوں نے کیسے بچا رکھا ہے تو کھل کر ہنسے اور کہنے لگے...... ''نہیں، میاں، کئی مرتبہ زبردست نقصان اُٹھائے مگر ظاہر نہیں کیا اور محنت کر کے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔'' کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد گویا ہوئے...... ''ساری عمر ادب اور تجارت کا ایسا امتزاج قائم رکھا کہ تجارت کے منفی اثرات ادبی سرگرمیوں پر کبھی نہیں پڑے۔ لیکن ادب کے مطالعے نے اعلیٰ انسانی اقدار کا جو درس دیا اس کا اطلاق تجارت پر بھی کرنے کی سعی کی اور بہت کم ناکامی حاصل کی۔'' ہم نے کچھ کہنا چاہا تو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا

اور گویا ہوئے...... "دراصل بہت زیادہ دولت کا ہونا آپ کو انسانی قدروں سے دور کر دیتا ہے اور زردار دنیا میں اچھے کام نہیں کر پاتے۔ اس لیے میں دولت کے پیچھے کبھی ہاتھ دھو کر نہیں پڑا۔" اتنا کہہ کر انہوں نے سچ بولنے والی بتیسی منہ سے نکال کر پیالی میں رکھ دی اور پھر مسکرانے لگے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب گفتگو ختم اور محفل برخواست ہوئی۔

راستہ بھر ہم یہی سوچتے رہے کہ یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ رضا صاحب کو کمیونسٹوں سے بالکل رغبت نہیں ہے۔ پھر بھی ان کی بات کارل مارکس کے اس قول سے کتنی مطابقت رکھتی ہے کہ...... "بورژوا سوسائٹی ہم سے انسانی صفات چھین لیتی ہے اور اس کے عوض ہمیں دولت دے دیتی ہے۔"

گو کہ گپتا جی ذہنی طور پر سرمایہ داروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر کارل مارکس آج کے عہد میں پیدا ہوا ہوتا اور اس کی ملاقات گپتا جی سے ہو جاتی تو یقیناً سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے متعلق اس کی رائے کسی حد تک تبدیل ہو جاتی یا کم از کم اس کی شدت میں ضرور کمی ہو جاتی۔

شرافت اور تجارت رضا صاحب کو ورثے میں ملی ہے۔ اس لیے ان دونوں چیزوں کے لیے انہیں مورد الزام ٹھہرانا مناسب نہیں ہے۔ حیرت البتہ کی جا سکتی ہے کہ جو شخص جالندھر کے نسبتاً گمنام قصبے مکند پور کے ایک کٹر مذہبی اور ساہوکار گھرانے میں پلا بڑھا ہو، ادبی تحقیق کی طرف کس طرح مائل ہوا ہوگا، اور جس شخص کا خاندانی پیشہ سودی کاروبار رہا ہو وہ ظالم اور بے رحم ہونے کی بجائے حلیم الطبع اور منکسر المزاج کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے سماج کے کمزور اور مظلوم طبقے سے ہمدردی کیوں کر ہو سکتی ہے۔ گپتا جی کے والد آریہ سماجی تھے اور انہوں نے سوامی شردھانند سے تعلیم پائی تھی۔ ایسے کٹر ہندو گھرانے کا چشم و چراغ جس نے دس برسوں تک آر۔ ایس۔ ایس کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہو، جس کے تعلقات گرو گولوالکر تک سے خوشگوار رہے ہوں وہ اتنا سیکولر اور وسیع المشرب کیسے ہو گیا کہ اس کے مہمانوں کی اکثریت مسلمان ادیب و شاعر اور صحافیوں (یہاں تک کہ مذہبی رہنما بھی!) پر مشتمل ہوتی ہے۔ سچ پوچھئے تو ایک عرصہ تک

ہم بھی ان کے متعلق تذبذب کا شکار رہے لیکن دسمبر ۱۹۹۲ء میں جب بمبئی کے غریب مسلمانوں اور وردی پوش ہندوؤں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات نے زور پکڑ لیا تھا تو ہمیں سب سے پہلے گپتا جی کا فون ہی موصول ہوا تھا، وہ کہہ رہے تھے...... "اگر آپ اپنے علاقے میں محفوظ نہ ہوں تو بلا تکلف اپنی فیملی کے ساتھ میرے غریب خانے پر تشریف لا سکتے ہیں۔"

اس کے بعد ۱۴/ جنوری ۱۹۹۳ء کا دن تو ہم کبھی بھول نہیں سکتے جب حکومت کی سرپرستی میں بمبئی کے مسلمانوں کے جان و مال کی ہولی جلائی جا رہی تھی اور ہم اسی فرقہ پرست حکومت کے اعزازیافتہ ممبر سکریٹری اردو اکادمی بنے بیٹھے تھے۔ ہمارے ساتھ کئی ممبران اکادمی نے طے کیا کہ حکومت کے رویے کے خلاف احتجاجاً اکادمی سے استعفیٰ دینا چاہیے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ اکادمی کے دو ممبران غیر مسلم ہیں۔ اگر وہ بھی اس احتجاج میں شامل ہو جاتے تو اردو ادیبوں، شاعروں اور سرگرم خدمت گزاروں کے سیکولر کردار کا حکومت کو بھی ثبوت مل جاتا۔ سب سے پہلے جس معزز ممبر کو فون کیا گیا ان کے اردو ادیبوں پر بہت احسانات ہیں لیکن اس روز ان کی تجارتی مصلحتیں، اردو کے عشق پر غالب آ گئیں۔ وہ صاف انکار کر گئے۔ ہم نے مایوس ہو کر بادل نخواستہ گپتا جی کا فون ملایا۔ انہوں نے خلاف توقع ہمیں ڈانٹ دیا اور کہنے لگے...... "آپ کو اس سلسلے میں سب سے پہلے مجھے فون کرنا چاہئے تھا۔ میں خود کئی روز سے اس مسئلے پر غور کر رہا تھا اور اب میں دل و جان کے ساتھ آپ حضرات کے ساتھ ہوں۔" اس کے بعد انہوں نے اپنے لیٹر ہیڈ پر فوراً استعفیٰ لکھ کر ایک گھنٹے کے اندر بھیج کر ہمیں شرمندہ کر دیا۔

ہم نے پچھلے دنوں ہمت کر کے گپتا جی سے پوچھ ہی لیا...... "آپ کے اس سیکولر کردار کی تشکیل آر۔ ایس۔ ایس کی تربیت اور گرو گولوالکر کی صحبت کا نتیجہ تو ہو نہیں سکتی۔ پھر آپ کا یہ مزاج کیسے بنا؟"

یہ سن کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر کہنے لگے۔ "میں ۲۳/ برس کی عمر میں افریقہ چلا گیا تھا جہاں میں تقریباً ۲۲/ برس رہا۔ وہاں کیمبرج کے امتحانات پاس کرنے،

بیرسٹری کرنے اور ذاتی کاروبار کرنے کے علاوہ میں نے دوسرے مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا جس نے کشادہ ذہنی پیدا کی اور ادھر ۴۵ ربرسوں سے میں مذہبی تو ضرور ہوں لیکن کٹر پنتھی نہیں۔ دوسرے مذاہب کی تعلیمات کی دل سے قدر کرتا ہوں اور آریہ سماج اور آر۔ایس۔ ایس دونوں کے اصولوں سے اب کوئی یگانگت نہیں۔ دراصل فرقہ پرستی کو وہی اپنا سکتا ہے جس نے اپنے مذہب کا بھی مطالعہ ٹھیک سے نہ کیا ہو۔ جہاں تک اردو ادب کے مطالعہ کا سوال ہے، میں دوسروں کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرے مزاج کی تشکیل میں خصوصاً اردو شاعری کے مطالعہ نے اہم کردار نبھایا ہے۔''

ہم نے موقع ملتے ہی کہا...... ''آپ نے اردو کلاسیکی اور جدید شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ آپ داغ اسکول کے آخری معتبر شاعر اور ماہر غالبیات بھی ہیں۔ پھر بھی آپ نہ صرف مئے نوشی سے کوسوں دور ہیں بلکہ آپ کی شاعری اور زندگی دونوں ہی میں واردات قلب کی شدت بھی نظر نہیں آتی۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟''

مسکراتے ہوئے کہنے لگے...... ''جناب، مئے نوشی تو میں نے تو بوجہ مجبوری بھی کبھی نہیں کی۔ البتہ تجارتی میٹنگوں میں شراب کے بل ضرور ادا کئے ہوں گے۔ ادھر ۲۰ ربرسوں سے تو میں مکمل طور پر سبزی خور بھی ہو گیا ہوں۔ مرغ و ماہی تو دور، اب تو انڈے میں بھی کشش نہیں رہی۔ آپ کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ واردات قلب کی شدت سے میں نے پرہیز کیا ہے۔ یوں بھی میں شاعری میں نمائشی عشق کے اظہار پر وجدان کو ترجیح دیتا ہوں......

مجھ کو وجدان کا ایک لمحہ بہت
یوم ہا کچھ نہیں، سالہا کچھ نہیں

......جہاں تک عملی زندگی کی بات ہے، یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ انہوں نے شاعری، سنگیت، شطرنج، ہاکی، فٹ بال، اقبالؔ، غالبؔ، داغؔ اور ساوتری (بیگم گپتا) کے علاوہ کسی سے عشق نہیں کیا۔

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ گپتا رضا صاحب جوشؔ ملسیانی کے باقاعدہ شاگرد

رہ چکے ہیں اور وہ شاعر اور محقق ہونے کے علاوہ اردو، فارسی کے عالم بھی ہیں اور وقت ضرورت اردو فارسی کے علما کی رہنمائی بھی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات کم لوگ ہی جانتے ہیں کہ وہ فن عروض کے ماہر بھی ہیں اور تقریباً دو درجن سے زائد شعراء ان کے باقاعدہ شاگرد ہیں۔ ہمارے خیال میں گپتاجی کا ایک احسان اردو ادب پر یہ بھی ہے کہ انہوں نے تنقید کی بجائے تحقیق کو اپنا میدان چنا۔ یوں بھی ایک شریف النفس اور ایماندار شخص سب کچھ بن سکتا ہے، لیکن ایک کامیاب تنقید نگار نہیں بن سکتا۔ خود گپتاجی کے مطابق تنقید میں کوئی حتمی بات نہیں ہوتی۔ شمس الرحمٰن فاروقی جسے اچھا کہتے ہیں، گوپی چند نارنگ اسے بُرا کہتے ہیں، جبکہ تحقیق حتمی فیصلہ کردیتی ہے۔"

کالی داس گپتا رضا صاحب نے اردو ادبی تحقیق کو شگفتہ اور سادہ نثر سے متعارف کرانے کا کارنامہ بھی انجام دیا ہے لیکن اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ نثر اتنی شگفتہ نہ ہو جائے کہ وہ مزاحیہ تنقید سے میل کھانے لگے۔ وہ نثر میں زبان و بیان کی فصاحت اور شاعری میں عروض کی باریکیوں کا احترام اور لحاظ کرنے والے آخری لوگوں میں سے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد یہ لوگ ہمارے لیے تبرک ہو جائیں گے۔ ان کا تازہ کارنامہ دیوان غالبؔ کی اشاعت ہے جسے انہوں نے تاریخ وار ترتیب دیا ہے۔ اسے وہ اپنی زندگی کا آخری اہم کام قرار دیتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں، وہی موت سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسان کی موت نہیں ہوتی۔ جسم مرتا ہے اور روح چولا بدلتی ہے۔ اس لیے وہ اس تبدیلی سے نہیں ڈرتے......

حیات و موت سے ہوں خوب واقف
بہت اس راہ سے آیا گیا ہوں

○○

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	پھول جیسے لوگ (ناول)	انور خان	80.00
۲۔	یادبسیرے (افسانے)	انور خان	80.00
۳۔	لمحوں کی قید (افسانے)	کشور سلطانہ	80.00
۴۔	افسانہ ۸۹ء (انتخاب)	مرتب: انیس امروہوی	80.00
۵۔	قند وقند (طنز ومزاح / نیا ایڈیشن)	فیاض احمد فیضی	150.00
۶۔	بھوکا ایتھوپیا (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	110.00
۷۔	ڈار سے بچھڑے (افسانے)	سید محمد اشرف	100.00
۸۔	کنیادان (ڈرامے)	وجے تنڈلکر (اردو ترجمہ: ڈاکٹر صادق)	80.00
۹۔	راہ میں اجل ہے (افسانے)	زاہدہ حنا	100.00
۱۰۔	اسرارِ غالبؔ (تنقید)	سید قدرت نقوی	60.00
۱۱۔	اردو فکشن کی تنقید (تنقید)	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	250.00
۱۲۔	جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب (افسانے)	مرتب: انیس امروہوی	90.00
۱۳۔	ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک (سفرنامہ)	ڈاکٹر قمر رئیس	100.00
۱۴۔	سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ (افسانے)	حسین الحق	80.00
۱۵۔	اردو افسانے کا پس منظر (تنقید)	فیاض رفعت	60.00
۱۶۔	آئینے کی گرد (افسانے)	شکیل جاوید	80.00
۱۷۔	سب رس: جدید اردو میں (تنقید)	قاضی انیس الحق	150.00
۱۸۔	شام اودھ (ڈرامے)	ڈاکٹر شبیر صدیقی	100.00
۱۹۔	اردو کے نثری اسالیب (تنقید)	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	150.00
۲۰۔	کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ (تنقید)	ڈاکٹر ابرار رحمانی	150.00
۲۱۔	اردو افسانے پر مغربی ادب کے اثرات (تنقید)	ڈاکٹر شہناز شاہین	120.00
۲۲۔	ہوئے ہم دوست جس کے (شخصی خاکے)	مجتبیٰ حسین	80.00

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
۲۳۔	معاصر اسلامی تحریکات اور فکرِ اقبال (تنقید)	ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی	150.00
۲۴۔	ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید (تنقید)	احمد سہیل	200.00
۲۵۔	اردو میں قصیدہ نگاری (تنقید)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	150.00
۲۶۔	اردو شاعری کے روشن چراغ (تذکرہ)	طارق متین باغپتی	100.00
۲۷۔	اصطلاحاتِ نفسیات: تشریح و تفہیم	سیّد اقبال امروہوی	200.00
۲۸۔	حاضر حال جاری (افسانے)	سریندر پرکاش	250.00
۲۹۔	نادید (ناول)	جوگندر پال	150.00
۳۰۔	جدید نفسیات (نفسیاتی مضامین)	سیّد اقبال امروہوی	150.00
۳۱۔	غمِ دل وحشتِ دل (ناول)	ڈاکٹر محمد حسن	250.00
۳۲۔	بھگت سنگھ کی واپسی (ڈرامے)	ساگر سرحدی	150.00
۳۳۔	مسیحا کی موت (افسانے)	قاضی انیس الحق	200.00
۳۴۔	شہرِ نگاراں (ناول)	رفعت سروش	200.00
۳۵۔	رسالہ "جامعہ" کا تنقیدی مطالعہ (تحقیق)	ڈاکٹر فرزانہ خلیل	300.00
۳۶۔	قرات: مطالعہ، محاسبہ (تنقید)	مرتب: ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	120.00
۳۷۔	فساد (ناول)	مہر الدین خاں	100.00
۳۸۔	گلدستۂ بیت بازی (شاعری)	مرتب: ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی	200.00
۳۹۔	تنقیحات (تنقیدی مضامین)	ڈاکٹر نیر جہاں	120.00
۴۰۔	جوگندر پال کی کہانیاں (افسانے)	جوگندر پال	180.00
۴۱۔	جوشؔ ملیح آبادی: خصوصی مطالعہ	مرتب: ڈاکٹر قمر رئیس	200.00
۴۲۔	لندن کے رات دن (افسانے)	علی باقر	350.00
۴۳۔	نثری بیانیہ (تنقید)	ڈاکٹر مجید بیدار	150.00
۴۴۔	دردکا رشتہ (افسانے و ناولٹ)	راشد سہسوانی	200.00
۴۵۔	پرائی چیز (بچوں کی کہانیاں)	شکیل جاوید	120.00
۴۶۔	گزرگاہِ خیال (مضامین)	پروفیسر ساجدہ زیدی	200.00
۴۷۔	متاعِ شادؔ (شاعری)	منشی بشن دیال شادؔ دہلوی	100.00

۴۸۔ روداد انجمن (رپوتاژ)	حمید اختر	200.00
۴۹۔ عورت: زندگی کا زنداں (مضامین)	زاہدہ حنا	250.00
۵۰۔ اُردو ناول کے اسالیب (تنقید)	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	250.00
۵۱۔ ایک کتاب اور...... (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	150.00
۵۲۔ روز مرّہ کی نفسیات (نفسیاتی مضامین)	سید اقبال امروہوی	180.00
۵۳۔ مولانا شبلی: ایک تنقیدی مطالعہ (تنقید)	ڈاکٹر نیر جہاں	250.00
۵۴۔ نقد نگاہ (تنقید)	لطف الرحمٰن	200.00
۵۵۔ قمر رئیس: ادبی و علمی شناخت (شخصیت)	مرتب: خوشنودہ نیلوفر	200.00
۵۶۔ پریم چند: نئے تناظر میں (تنقید)	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	200.00
۵۷۔ عورت اور سماج (تنقید)	ڈاکٹر محمد شہزاد شمس	140.00
۵۸۔ ہندستان کا سرخ سفر (سیاسی تاریخ)	نریش ندیم	300.00
۵۹۔ وہ بھی ایک زمانہ تھا (فلمی شخصیات)	انیس امروہوی	250.00
۶۰۔ خیال کی مسافت (مضامین)	شمیم حنفی	300.00
۶۱۔ سفر کہانی (پاکستانی سفرنامہ)	مرغوب علی	120.00
۶۲۔ ناکام محبت: ساحر لدھیانوی (شخصیت)	اظہر جاوید	180.00
۶۳۔ پھر سوئے حرم لے چل (سفرنامۂ حج)	سہیل انجم	100.00
۶۴۔ صحرائی شب و روز (ناول)	سُنیل گنگوپادھیائے (مترجم: ٹوٹن مکھرجی، اے۔ آر۔ منظر)	120.00
۶۵۔ جاتے جاتے (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	120.00
۶۶۔ رات، شہر اور زندگی (مضامین)	شمیم حنفی	250.00
۶۷۔ چاہت کے رنگ (ناول)	طاہر تنویری	250.00
۶۸۔ راستہ بند ہے (ناول)	مصطفیٰ کریم	220.00
۶۹۔ نقوشِ جاوداں (سوانح)	ڈاکٹر شمس کمال انجم	200.00

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B, YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR, DELHI-110092

PH. 011-22442572, 9811612373 E-mail : qissey@rediffmail.com

فیاض احمد فیضی

یوں تو فیاض احمد فیضی کے خاندان کا تعلق شیر شاہ سوری کے صوبہ بہار کی بودھ دھرتی گیا سے ہے، مگر ان کی پیدائش عروس البلاد ممبئی میں جناب قاری عبدالصمد (مرحوم) کے یہاں ۲۴ فروری ۱۹۵۴ء کو ہوئی اور ممبئی کے مہاراشٹر کالج سے بی۔اے کرنے کے بعد اردو فارسی میں ایم۔اے بھی وہیں سے کیا۔ حالانکہ اُن کا پڑھا لکھا ہوا اُن کی معاش میں کام نہ آیا کیونکہ انہوں نے پیشے کے اعتبار سے بینکنگ کا انتخاب کیا۔ اردو فارسی تعلیم کا فائدہ انہوں نے یوں اُٹھایا کہ ۱۹۷۵ء میں فارغ المعاش ہو کر طنز و مزاح میں لکھنا شروع کر دیا۔ ۲۶ برس تک بینک آفیسر اور منیجر کی خدمات انجام دینے کے بعد ۲۰۰۱ء میں رضا کارانہ طور پر ملازمت سے سبکدوشی اختیار کر لی۔ اب وہ کل وقتی طور پر طنز و مزاح کے مضامین کے علاوہ تجارت و معیشت جیسے موضوعات پر لکھتے ہیں اور ادبی ڈرامے اور ٹیلی ویژن پروگرام لکھنے اور پیش کرنے میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ فیاض احمد فیضی ۱۹۸۸ء میں کراچی، پاکستان میں منعقدہ پہلی طنز و مزاح کانفرنس میں بھی شریک ہوئے اور بے حد پسند کیے گئے۔ وہ ''زندہ دلان حیدرآباد'' کے سالانہ ادبی اجلاس میں بھی پابندی کے ساتھ بلائے جاتے ہیں۔ آج کل وہ ممبئی کے مشہور و معروف تعلیمی ادارے ''انجمن اسلام'' میں ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن کے عہدے پر فائز ہیں۔ زیر نظر کتاب **قند مکرر** اُن کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔

— انیس امروہوی

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

104/B, Yawar Manzil, I-Block, Laxmi Nagar, Delhi-110092

Ph : 011-22442572, 9811612373 E-mail : qissey@rediffmail.com